November
2021

جدید ترادب کا استعارہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

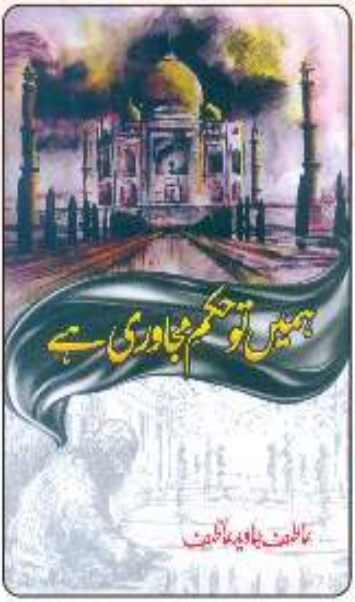

بحرِ تجلّیات
نعتیہ کلام
ریاض ندیم نیازی

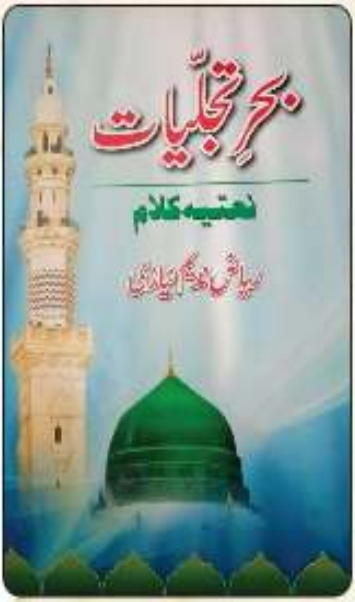

ہمیں تو حکم مجاوری ہے

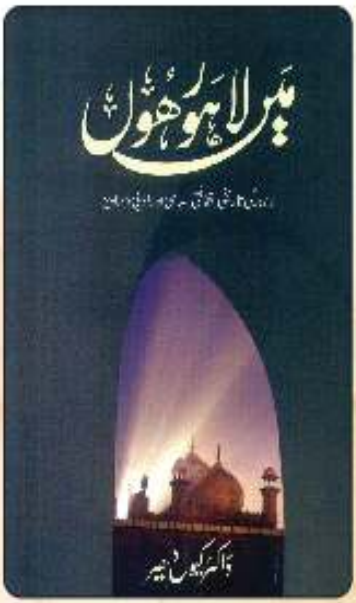

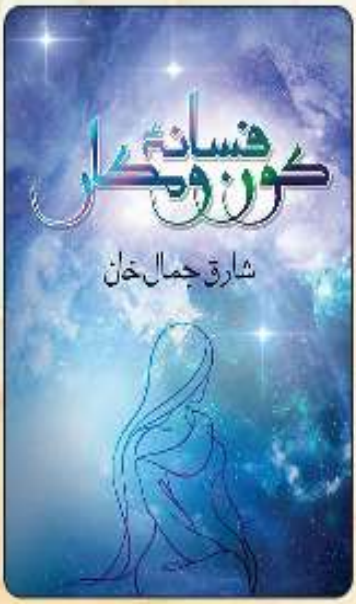

فسانۂ کون و مکاں
شارق جمال خان

میں لاہور ہوں

الجھنیں

آگہی حرف کا ظرف ہے
اَن کہی داستاں کہہ گئے
آئینے دیکھتے رہ گئے
زندگی حرف کا صرف ہے
پھر مجھے تھامنے آ گئے
موت کے ہاتھ میں ہاتھ ہے
زندگی ہر قدم ساتھ ہے
پھر وہی سامنے آ گئے
راستوں میں کھڑے رہ گئے
زندگی بھر ہمکتے رہے،
مہ وشوں پر لپکتے رہے،
پالنوں میں پڑے رہ گئے
اَن کہی اَن سنی کیوں رہے
اجنبی اجنبی کیوں رہے

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا شاریہ

ماہنامہ بیاض لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 29 - نومبر 2021 - شمارہ نمبر: 11

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران - حاذق اسد

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق:

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور- 53700

فون: 3-37513000-42-92 فیکس: 37512517-42-92

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ

www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر رائل پارک نیاز بیگ سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	حسن عسکری کاظمی، ریاض مجید، سید ریاض حسین زیدی	7 تا 9
2	نعت	ریاض مجید، آصف ثاقب، جلیل عالی، سید ریاض حسین زیدی نسیم سحر، محمد انیس انصاری، سرور حسین نقشبندی، محمد یٰسین قمر ریاض رومانی، عقیل رحمانی، سید فرخ رضا ترمذی محمد حسین عارف، اشرف شاہد، سعدیہ بشیر	10 تا 23
3	دعا	جمیل یوسف	24
4	عقیدت	فرحت عباس، مرزا آصف رسول	25 تا 26
5	ہائیکو	خاور اعجاز	27
6	تصوف	سلیمان عبداللہ ڈار	28 تا 32
7	افسانے	حبیب الرحمٰن، دردانہ نوشین خان، ناصر نقوی انعام الحسن کاشمیری، عمار نعیمی، سمیرا کیانی	33 تا 64
8	آبیتی	شوکت علی شاہ	65 تا 74
9	غزلیں	خالد احمد، آصف ثاقب، جلیل عالی، جمیل یوسف، محسن اسرار نسیم سحر، اعجاز کنور راجہ، حسن عسکری کاظمی، غلام حسین ساجد محمد انیس انصاری، خاور اعجاز، حسن عباس رضا، گلزار بخاری خالد علیم، حامد یزدانی، سید نواب حیدر نقوی، سید قاسم جلال	75 تا 166

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
9	غزلیں	رشید آفرین، ریاض رومانی، علی اصغر عباس، سید مقبول حسین رخسانہ صبا، رحمان حفیظ، اقبال سروبہ، فرحت عباس، ممتاز راشد لاہوری اکرم ناصر، خورشید ربانی، اعجاز روشن، شوکت محمود شوکت، سعید راجہ اشرف کمال، انیس احمد، احمد جلیل، اکرم جاذب، افتخار شاہد ارشد محمود ارشد، عمران اعوان، رخشندہ نوید، ملیحہ سیّد، صائمہ آفتاب شفیق آصف، حسنین سحر، عابد سیال، اشرف شاہد، ماجد یزدانی محمد نوید مرزا، اسحاق وردگ، مظہر حسین سیّد، ثمینہ سید ریاض ندیم نیازی، شاہد ماکلی، اعجاز ثاقب، عنبرین خان نعیم رضا بھٹی، بشیر احمد حبیب، نیلم ملک، سرور فرحان، طارق نعیم ظہور چوہان، انصر حسن، امجد بابر، علی حسین عابدی، تصور اقبال طالب انصاری، حکیم خان حکیم، سید ضیا حسین، امر مہکی، وسیم جبران وحید ناز، احمد محمود، عاطف جاوید عاطف، رخسانہ سمن، محمد علی ایاز لبنیٰ مقبول نعیم، نفیس فاروق، معین ناصر، طاہر مظفر ملک سجاد حسین ساجد، آفتاب محور شمس، عمر قیاز قاتل، دستگیر قمر تہذیب حسین برچہ، نعمان حیدر حامی، ازور شیرازی، فرحانہ عنبر مصطفیٰ مغل، نیاز خان اعوان، نائیلہ راٹھور، سرفراز تبسم فیصل زمان چشتی، عزم الحسنین عزمی، ظفر اقبال نادر، شہاب اللہ شہاب	75 تا 166
10	شاعرِ امروز	شہیر تہامی، شعیب افضال [شاہد ماکلی]	167 تا 171
11	طنز و مزاح / خاکہ	احمد حسین مجاہد، نور کمال شاہ	172 تا 179
12	مضامین	حسن عسکری کاظمی، حامد یزدانی، اعجاز ثاقب، شاعر علی شاعر	180 تا 204
13	نظمیں	حسن عسکری کاظمی، امجد اسلام امجد، خاور اعجاز، نسیم سحر، گلزار بخاری صفدر صدیق رضی، اسلام عظمی، خالد علیم، حامد یزدانی علی اصغر عباس، فرحت پروین، فرحت عباس، محمد نوید مرزا امجد بابر، فرخندہ شمیم، شاہنواز زیدی، رخشندہ نوید سید فرخ رضا ترمذی، وسیم جبران، شاہدہ مجید، ظفر اقبال نادر سید ضیا حسین، زعیم رشید، مظہر حسین مظہر، نائیلہ راٹھور، خالق آرزو	205 تا 234
14	خطوط	آصف ثاقب، جمیل یوسف، نسیم سحر، آفتاب احمد ملک طالب انصاری، اشرف کمال، رانا محمد شاہد	235 تا 241

حمد

ایسا قرینہ مدح کا عرضِ ہنر میں ہے
خوشبو کے ساتھ ذائقہ جیسے ثمر میں ہے

اک حرفِ کُن سے ہو گئی تکمیلِ کائنات
ہر بھید کائنات کا اس کی نظر میں ہے

پتوار بھی اسی کے ، محافظ بھی خود وہی
کب میری زندگی کا سفینہ بھنور میں ہے

اس نے قبول کی ہے براہیمؑ کی دعا!
ہر دم فضائے امن بھی خالق کے گھر میں ہے

وہ رب العالمین ہے ، یہؐ رحمتِ تمام
اس کی عطا سے وصف یہ خیرالبشرؐ میں ہے

شب کا سکوت قربِ الٰہی کا آئینہ
پردہ نشیں کا حُسن بھی نورِ سحر میں ہے

غفار ہے وہ میں نے اُٹھائے دعا کے ہاتھ
صد شکر مغفرت کا سبب چشمِ تر میں ہے

حسن عسکری کاظمی

حمد

بنا ہے دامنِ ہر حرف، کہکشانِ حمد
زمینِ لفظ پہ اُترا ہے آسمانِ حمد

ہزار عمرِ خضر بھی ادائے شکر کو کم
کسی بھی طور مکمل نہ ہو بیانِ حمد

تمام خلق نے مل کر جو آج تک کی ہے
ہے ناتمام سی اک سعی در گمانِ حمد

ریاض سوچ یہ غربال لفظ کے اندر
سمٹ سکے گا کبھی بحرِ بیکرانِ حمد؟

ہیں خاک بستہ مرے لفظ، گنگ اور حیران
سفر میں نُور کی رفتار سے ہے شانِ حمد

جھکائے رکھئے گا خواب میں بھی، شکر میں سر
ہمہ میسر و امکاں ہے آستانِ حمد

ندامتوں کے اسیرِ خیال! تُو ہی بتا
سوائے عجز بیاں کیا ہو ارمغانِ حمد؟

خجالتوں سے بھری زندگی! اشارہ کر
دبیز چُپ کے علاوہ ہو کیا زبانِ حمد؟

شہادت اُس کی ربوبیت اور عظمت کی
ہر ایک ذرّۂ تخلیق ہے نشانِ حمد

ریاض مجید

حمد

ہے سب کائناتوں کا خالق خدا
نہیں اس سے بڑھ کر کوئی بھی بڑا

وہی دل کہ جس میں وہ گھر کر گیا
وہی گھر۔۔۔وہی دل۔۔ہوا پارسا

کوئی جان پرور ہے، بےجان ہے
اسی کا وہ مرہون منت ہوا

کوئی حدِ امکاں میں ہے یا نہیں
نہیں حکمِ کن سے کوئی ماورا

یہ پیار و محبت، یہ انس و وفا
یہ انسانیت ہے اسی کی عطا

اعانت طلب ہے اسے پیار ہے
اک اشک ندامت ہوا کیمیا

کوئی اس کی نیکی کا ہم سر نہیں
جو اس کے لیے ہر بدی سے لڑا

رسالت ہے توثیق توحید کی
ریاض عقیدت ہے جوبن بھرا

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

وہ عدالت کہ جہاں ہونا ہے آخر حاضر
ساتھ ہو میرے مرا حامی و ناصر حاضر

وردِ لب کرتے ہوئے 'آیہ جاوک' کا
اُس کے دربار میں سب ہوتے ہیں زائر حاضر

ایک مجلس یہاں ہر رات لگا کرتی ہے
جس میں ہوتے ہیں گئے وقتوں کے زائر حاضر

روحیں لگتی ہیں وہ مرحوم ثنا خوانوں کی
صبح دم ہوتے ہیں جو روضے پہ طائر حاضر

ملتجی ہوں تری رحمت ہو قریں رب کے حضور
ایک اک کر کے ہوں جب نعت کے شاعر حاضر

ہے دعا تیری شفاعت ہو مددگار مری
اُس عدالت میں، جہاں ہونا ہے آخر حاضر

حکم فرمائیں کبھی آپؐ غلام اپنے کو
دوڑتا آؤں میں کہتا ہُوا 'حاضر حاضر'

گھر، مدینے سے پلٹتے ہی یہ دل کرتا ہے
جلد ہم آپ کے دربار میں ہوں پھر حاضر

ریاض مجید

نعتؐ

مدینے سے اجالا مل گیا ہے
"وسیلہ حسن والا مل گیا ہے"

رسائی ہو گئی اپنی خدا تک
محمدؐ کا حوالہ مل گیا ہے

درودی اشک جھولی میں بھرے ہیں
گناہوں کا ازالہ مل گیا ہے

کبوتر ہو گیا میرا پیامی
مجھے مکڑی کا جالا مل گیا ہے

نبوت چاند ہے اس کے جلو میں
مسلمانوں کو ہالا مل گیا ہے

کتابوں میں پڑھا سیرت کا حصہ
مقالے سا مقالہ مل گیا ہے

درودِ پاک سے ہر اُمتی کی
طبیعت کو سنبھالا مل گیا ہے

نبیؐ کی یاد میں رہنے کی خاطر
مجھے سینے کا چھالا مل گیا ہے

مقدس گھر کا پانی پی رہا ہوں
مدینے کا پیالہ مل گیا ہے

نہیں ہے اور کوئی عشق ثاقبؔ
ہمیں جب کملی والا مل گیا ہے

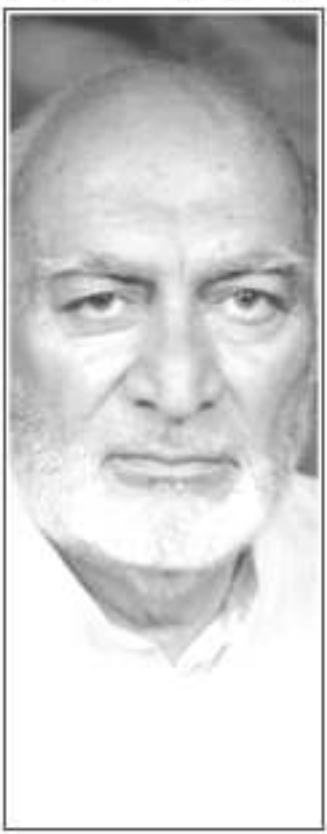

آصف ثاقب

نعتؐ

کی اُسؐ نے اک نگاہ تو ہر شے بدل گئی
صدیوں سے ڈولتی ہوئی دنیا سنبھل گئی

تقریر اُسؐ کی نوبتِ حرفِ خدا بنی
تدبیر اُسؐ کی غایتِ قدرت میں ڈھل گئی

ایسا کبھی ہوا نہیں پوری ہوئی نہ ہو
جو بات بھی زبانِ نبیؐ سے نکل گئی

دریائے نورؐ آ گیا جب اپنے جوش پر
عالم میں دُور دُور تلک اُس کی چھل گئی

ہر اک سوال کا درِ شہؐ سے ملا جواب
کس کس دوار عقل نہیں بہر حل گئی

شام و سحر حیات کے محفوظ ہو گئے
ہر غم کی گھات اُسؐ کی توجہ سے ٹل گئی

جب بھی فرازِ وقت سے اُسؐ کی صدا سنی
ہر سمت سے دلوں کی وفا سر کے بل گئی

اک رَو کا راستہ جہاں روکا گیا وہاں
اک لَو ورائے عقل عجب چال چل گئی

عالی اُسیؐ سے سوزِ سخن ہے سو اِس لیے
خالی نہ بیتِ نعت سے کوئی غزل گئی

جلیل عالی

نعتؐ

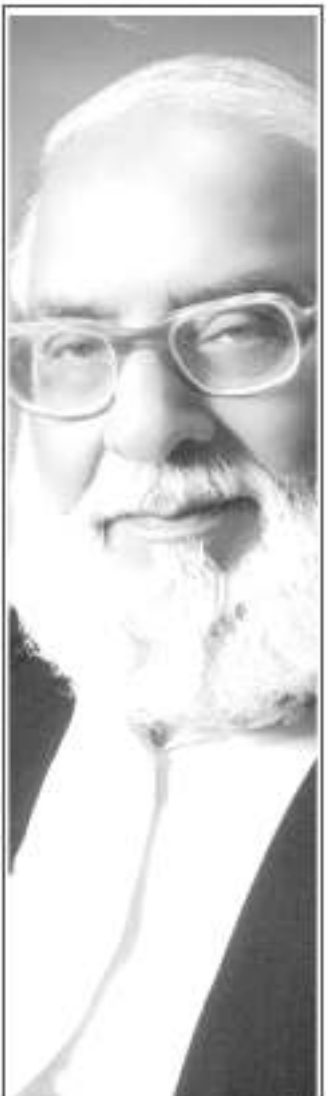

حبذا، مجھ کو میسر جو سفر آیا ہے
شکر ہے سامنے طیبہ کا نگر آیا ہے

عالمِ وجد میں دیکھا ہے مدینہ جس نے
سلسلہ نور کا اس دل میں اتر آیا ہے

آپؐ کی یاد میں یوں اشک فشاں ہیں آنکھیں
جیسے دریا کوئی چپکے سے بپھر آیا ہے

خوشنما ہوتا گیا آپؐ کے دم سے گلشن
روپ خوبانِ چمن کا بھی نکھر آیا ہے

وقت بنجر تھا مگر آپؐ کی رحمت کے طفیل
شجرِ زیست پہ کیا خوب ثمر آیا ہے

جب بھی تاریخ کے اوراق پلٹ کے دیکھے
آپؐ کا فیض بحر گام نظر آیا ہے

آپؐ کے ذکر سے کھلنے لگے وجدان میں پھول
شکر ہے مدحِ رسالت کا ہنر آیا ہے

فیض ہے مجھ پہ ریاض آپ کا ہر دم ہر آن
میرے اشعار پہ اک رنگِ دگر آیا ہے

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

اَور کِس کو لکھے یہ قلم ذی حَشَم؟
آپؐ سا کون ، شاہِ اُمم ، ذی حَشَم!

میرے اشکوں کی آواز سن لیجیے
کہہ رہا ہوں جو باچشمِ نم ، ذی حشمؐ

نعت لکھی تو دل کچھ ہوا مطمئن
نعت لکھ کر ہوا ہے قلم ذی حشم

اَور کس پر یہ القاب سجتا لگے؟
بس وہی ہستیِ محترمؐ ، ذی حشم

مُجھ کو توفیق دیجے ، کہ مَیں کر سکوں
وردِ صلِ علیٰ دم بدم ، ذی حشمؐ

میرے حالِ زبوں پر نظر کیجیے
مجھ پہ کچھ گا اپنا کرم ، ذی حشمؐ

خَیر ہی خَیر ہیں ، خَیر ہی خَیر ہیں
میرے آقا ہیں خیرالاُممؐ ذی حشم

آپؐ کے زیرِ سایہ جئیں ہم سدا
یہ عنایت کبھی ہو نہ کم ، ذی حشمؐ

اُنؐ کا کوئی مقابل نہیں ہے نسیم
ساری دنیا سے وہ محترم ، ذی حشم

نسیمِ سحر

نعتؐ

شب کو راحت مِرے حضورؐ کی ہے
یہ عنایت مِرے حضورؐ کی ہے

گُو بہ گُو کہہ رہی ہے بادِ صبا
یہ صباحت مِرے حضورؐ کی ہے

پُھول جھڑتے ہیں اُنؐ کے ہونٹوں سے
کیا فصاحت مِرے حضورؐ کی ہے

آنکھ بس اُن کے خواب دیکھتی ہے
یہ رفاقت مِرے حضورؐ کی ہے

بے زُبانوں کی بات سُنتے ہیں
کیا سماعت مِرے حضورؐ کی ہے

جو یہودی کے حق میں فیصلہ دے
وہ عدالت مِرے حضورؐ کی ہے

پڑھنا چاہوں گا اپنی نعت، انیس
کیا اجازت مِرے حضورؐ کی ہے

محمد انیس انصاری

نعتؐ

چھوڑ کر عشق بتاں نعت لکھی جاتی ہے
بھول کے سود و زیاں نعت لکھی جاتی ہے

حرف تاروں کی طرح کیسے چمک اٹھتے ہیں
نور ہوتا ہے جہاں نعت لکھی جاتی ہے

اذنِ ممدوح سے کھلتی ہے گرہ مدحت کی
وہ نہ چاہیں تو کہاں نعت لکھی جاتی ہے

میں تصور میں پہنچ جاتا ہوں قدموں کے قریں
اشک ہوتے ہیں رواں، نعت لکھی جاتی ہے

کوئی یہ کہہ کے مجھے بزم غزل سے لایا
تم ادھر آؤ یہاں نعت لکھی جاتی ہے

صبح دم صحن حرم میں کہیں گنبد کے قریں
کیا بتاؤں جو وہاں نعت لکھی جاتی ہے

ہاؤ ہو کرنا تو عشاق کا شیوہ ہی نہیں
لب پہ جب آئے فغاں نعت لکھی جاتی ہے

خواب میں حضرتِ تائب جو ملیں تو پوچھوں
کس طرح شستہ، رواں نعت لکھی جاتی ہے

حرف کاری کا ہنر ان کی عطا ہے سرورؔ
مجھ نکمے سے کہاں نعت لکھی جاتی ہے

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

اے دل! یہ بڑا کرم ہوا ہے
مصروفِ ثنا قلم ہوا ہے

جب اُنؐ کے دیار کو چلے ہیں
انعام قدم قدم ہوا ہے

اے ذوقِ مسافرت مبارک!
منزل جو تری حرم ہوا ہے

ہے زیرِ لوائے حمد جو بھی
ممنونِ شہِ امم ہوا ہے

اخلاقِ نبیؐ کی شان دیکھو!
گرویدہ عرب، عجم ہوا ہے

اب دیکھیے کب؟ ہمیں بلائیں
ساماں تو قمر بہم ہوا ہے

محمد یٰسین قمر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مدح لکھوں میں کس کی خالد، کس کی حمد کروں
رحمت دو عالم ہیں، رحمت کل کے آئینہ دار

نعتؐ

دلوں تک اسمِ احمدؐ کی رسائی ہو رہی تھی
فضا ساری کی ساری مصطفائی ہو رہی تھی

جہالت کے اندھیروں کو مٹایا جا رہا تھا
جہاں میں علم کی فرمانروائی ہو رہی تھی

صدائے حق سے گونج اٹھا تھا اِس کا کونہ کونہ
وہی خطہ جہاں ہر اِک برائی ہو رہی تھی

لکھے جانے تھے اِس پر آپؐ کے اوصاف اعلیٰ
گناہوں سے بھرے دل کی صفائی ہو رہی تھی

فرشتوں نے کبھی دیکھے نہ تھے ایسے مناظر
فلک پر آپؐ کی یوں پیشوائی ہو رہی تھی

درودِ پاک ہم بھی پڑھ رہے تھے اور وہ بھی
ریاضؔ اپنی خدا سے ہمنوائی ہو رہی تھی

ریاض رومانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ان کے ذکر کا ہالہ ٹھہرے، کیا عجز اظہار
وہ جانِ جاں، وہ آقا، وہ دلبر وہ دلدار

نعتؐ

روح پر عشقِ محمدؐ کی قبا رہنے دے
جسم کی خاک میں بھی نُورِ رحِرار رہنے دے

شہنشاہوں کی طرح مجھ کو خدا رہنے دے
زندگی بھر مجھے آقا کا گدا رہنے دے

عشق میں ڈوبی ہوئی دل کی فضا رہنے دے
نورِ احمدؐ کو وہاں جلوہ نما رہنے دے

اِن کی مہکی ہوئی چھاؤں میں سکوں ملتا ہے
اُنؐ کی یادوں کا ہر اک پیڑ ہرا رہنے دے

آپؐ کے سارے غلاموں کا رہوں ادنیٰ غلام
میرے شاہاؐ یہ کرم مجھ پہ سدا رہنے دے

اس میں روشن ہے مرے آقاؐ کی الفت کا چراغ
چار سو دل کے مدینے کی ہوا رہنے دے

مجھ کو دربان بہت جلد نہ روضے سے ہٹا
میری نظروں کو تو جالی سے لگا رہنے دے

گنبدِ خضرا کی جی بھر کے زیارت کر لے
اپنے اشکوں کو تُو آنکھوں میں چھپا رہنے دے

مجھ کو دیدارِ محمدؐ ہے ملا وقتِ نزع
دوستا! اَب میری آنکھوں کو کھلا رہنے دے

میں تری نظرِ کرم کا رہوں منگتا ہر دم
مجھ گنہگار پہ بس اتنی عطا رہنے دے

مجھ کو جنت کی تمنا ہی نہیں کوئی عقیل
مجھ کو سرکارؐ کے قدموں میں پڑا رہنے دے

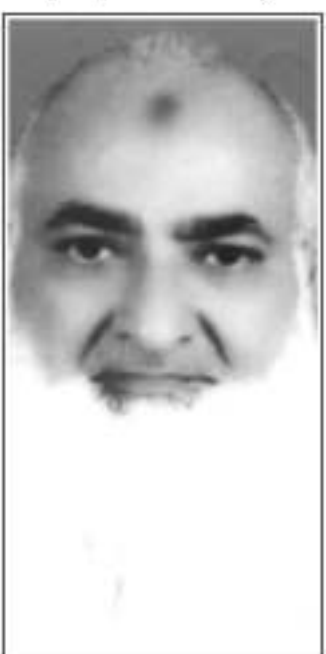

عقیل رحمانی

نعتؐ

کھڑا ہوں در پہ لئے اک سوال شاہِ عرب
ترے کرم سے عطا ہو کمال شاہِ عرب

حضور اپنے تو اپنے یہ غیر مانتے ہیں
نہیں ہے آپ کی کوئی مثال شاہِ عرب

تمہارے ماننے والے ہیں سخت مشکل میں
کٹھن گھڑی میں بھی تو ہی سنبھال شاہِ عرب

نفاق و کِذب کے موسم کا راج دھرتی پر
مری زمین کو سچ سے اجال شاہِ عرب

میں کچھ بھی لکھ نہیں سکتا تری عطا کے بغیر
تمہارے اذن سے آئے خیال شاہِ عرب

حسن حسین علی ،فاطمہ ترے پیارے
بیان کرتا ہوں ان کے خصال شاہِ عرب

تمہاری نعت سے دل کو سکون ملتا ہے
تمہاری یاد کرے ہے نہال شاہِ عرب

سید فرخ رضا ترمذی

نعتؐ

لب پہ میرے ہے شام و سحر یا نبی
ہے اسی ذکر میں آنکھ تر یا نبی

سب کا معبود مالک ہے خالق ترا
سب کا ہو ہر گھڑی راہ بر یا نبی

خود خدا کر رہا ہے تری ہی ثنا
تجھ سے باتیں کرے عرش پر یا نبی

میں گنہگار ہوں میں ترا امتی
مجھ پہ بھی ہو کرم کی نظر یا نبی

نور ایمان سے قلب پر نور ہو
زیست ہو طاعتوں میں بسر یا نبی

سبز گنبد کا منظر ہو چشمان میں
خوب دیکھوں حسیں تیرا گھر یا نبی

تیرا دیوانہ ہے عارف القادری
کیوں نہ ہو ہر عمل پر اثر یا نبی

محمد حسین عارف القادری

نعتؐ

شادمانی میں اک آنسو بھی نکل آیا ہے
روضۂ شاہ پہ بدّو بھی نکل آیا ہے!

ایک بازو سے ٹکا رکھا تھا سر جالی پر
رشک سے دوسرا بازو بھی نکل آیا ہے

محوِ پرواز پرندے ہیں مدینے کی طرف
دیکھ کر دشت سے آہو بھی نکل آیا ہے

اتنی زرخیز زمیں ہے کہ ثنا کرتے ہوئے
اک نئی نعت کا پہلو بھی نکل آیا ہے

ہر فصاحت تھی فقط اہلِ عرب کو زیبا
نعت میں صاحبِ اُردو بھی نکل آیا ہے

دیکھ کر مجھ کو مرے دل نے تشکر سے کہا
اوئے! خوش بخت یہاں تُو بھی نکل آیا ہے

صوفیا جانبِ طیبہ ہوئے شاہدؔ تیار
قافلہ دیکھ کے سادھو بھی نکل آیا ہے

اشرف شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لکھتے ہی اُنؐ کا اِسم مُبیںؐ جھلملا اُٹھیں
عرشِ ورق پہ کاہ کشانِ سخن تمام

نعتؐ

نعت کہنے کا ہم کو قرینہ نہیں
دل مصفا نہیں ، آنکھ بینا نہیں

میرے اللہ! تُو وحدہ لاشریک
تیرے محبوب سا بھی نگینہ نہیں

دل ہے بیکل طواف تمنا لیے
ہائے! ہم کو میسر مدینہ نہیں

ہم سے عاصی پکاریں گے صلی علی
جز محمد تو کوئی سفینہ نہیں

اسمِ خیرالوریٰ وردِ جاں ہے مرا
اس محبت سے باہر تو جینا نہیں

سعدیہ بشیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد احمد تری نسبت سے ہے خالد احمد
تو نے پاتال کی قسمت میں بھی رفعت لکھی

دعا

مرے سفر کا یوں ہی اختتام ہو جائے
ترے دیار سے گزروں تو شام ہو جائے

یہ لطفِ خاص ہو مجھ پر بھی اے مرے آقاؐ
ترے غلاموں میں میرا بھی نام ہو جائے

کرم ہو آقاؐ! مرا دیس بھی مدینہ بنے
جو کام ہو نہیں پایا، وہ کام ہو جائے

یہ سرزمین بھی جنت سے کم نہیں ہے اگر
یہاں ہر آدمی کا احترام ہو جائے

ہر ایک شخص ہو حضرت معاذؓ کی مانند
تو حُسنِ فکر و عمل شاد کام ہو جائے

وہی نظام جو سارے جہاں نے دیکھا تھا
اُسی نظام کا پھر اہتمام ہو جائے

ہر ایک پھول سے خوشبو اُٹھے محبت کی
کلی کا کھلنا، وفا کا پیام ہو جائے

مرے چمن میں کہیں خار و خس نہ رہنے پائیں
صبا کچھ اس طرح محوِ خرام ہو جائے

کسی زباں سے کسی بے نوا کا دل نہ دُکھے
ہر آدمی یہاں شیریں کلام ہو جائے

نہ دن کو خوف ہو کوئی، نہ رات کو کھٹکا
ہر ایک سانس سکوں کا پیام ہو جائے

نہیں ہے آپؐ کی معجز نمائیوں کا شمار
کرم کریں تو یہ سب اہتمام ہو جائے

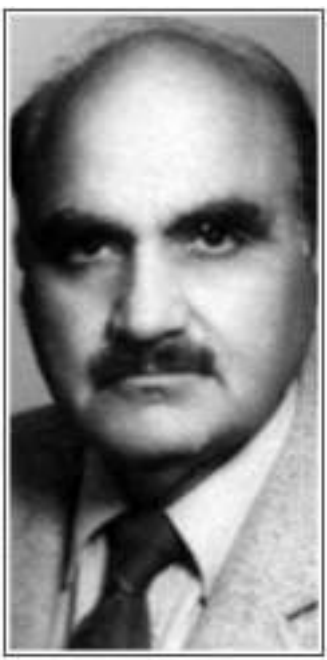

جمیل یوسف

عقیدت

توفیق ایسی بخش مکرّر ، مرے خدا
ہو مدحتِ حضورؐ زباں پر ، مرے خدا

ایسا مجھے بنا دے سخن ور، مرے خدا
حدِ ادب سے جاؤں نہ باہر ،مرے خدا

تخلیقِ دو جہاں کا سبب جن کی ذاتِ پاکؐ
ان کے لیے درودِ معطر، مرے خدا

سردارِ کائناتؐ ہیں میرے حضورِ پاکؐ
تجھ سے ہی اُنؐ کا نور منوّر، مرے خدا

حق کی حدیث، صاحبِ قرآں کے واسطے
میری زباں میں اور اثر کر، مرے خدا

توصیفِ مصطفیٰؐ کا جو منصب مجھے ملا
کیسا دیا مقامِ معطر، مرے خدا

فرحتؔ ہو ذکرِ سیدِ والا ہزار بار
دونوں جہاں میں دھوم ہو بڑھ کر ،مرے خدا

فرحت عباس

عقیدت

جو نعت سے بنتی ہے تری بات، رقم کر
اے دل! ورقِ جاں پہ بھی جذبات رقم کر

جن میں طلع البدر علینا کے ہوں منظر
قرطاسِ عقیدت پہ وہ ابیات رقم کر

اُس بارگہِ نور میں عصیاں کی سیاہی
دھل جائے گی اشکوں سے مُناجات رقم کر

اے علم! ترے بس میں کہاں اُن کی ستائش
تو خود پہ فقط اُن کی عنایات رقم کر

مفعول مفاعیل میں سوز اور نیا لا
مت نعت کے آہنگ پہ نغمات رقم کر

کر کِلک و قلم سیرت و سنت سے منور
اور کل کے لیے آج کے صفحات رقم کر

الفاظ نہیں دفترِ تعریف میں کافی
اے عشقِ نبی! اپنی بھی ذات رقم کر

قرآن سے لے فیضِ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ
اور پیرہنِ زیست پہ آیات رقم کر

حالات کے اوراق پہ اب صل علی سے
اے ارضِ بشر! نورِ سماوات رقم کر

لفظوں کو خدا نعت کے بخشے گا معانی
جو لکھ سکے اے خامۂ رشحات! رقم کر

جب تک نہیں وہ دن کہ مدینے میں ہوں راتیں
تو لوحِ تصور پہ وہ دن رات رقم کر

نقشہ نہ مٹے دل سے مدینے کا نہ جاں سے
جو روح نے کی ہیں وہ زیارات رقم کر

اے شوقِ ثنا گستریٔ شانِ پیمبر!
بس حسرتِ اظہار کے لمحات رقم کر

تہذیب کے یثرب میں ہیں ہجرت کے ورق اور
اے حبِّ مدینہ! تو مواخات رقم کر

اے خامۂ جاں! معرکہ طاغوت سے ہے آج
تو خندق و خیبر کی روایات رقم کر

یوں بھیج درود ان پہ کہ آفاق پکاریں
اے صل علی! ہم پہ تحیات رقم کر

مت نعت کے الفاظ و معانی پکڑ آصف!
یہ دفترِ دل ہے یہاں نیات رقم کر

مرزا آصف رسول

ہائیکو تراجم

The ants are walking
under the ground,
And the pigeons are
flying over the steeple,
And in between are the
people
(Elizebeth Madox Roberts)

چیونٹیاں چل رہی ہیں زیرِ زمیں
اور کبوتر فضاؤں میں رقصاں
درمیاں اِک ہجوم لوگوں کا

.....

Dusk
A lone car going the
same way
As the river
(George Swede)

شام کے سرمئی دھندلکے میں
ایک ہی سمت میں رواں دونوں
بیل گاڑی بھی اور دریا بھی

Leaf in my palm
its stem extends
My life line
(Helen Daive)

ایک پتّا مری ہتھیلی پر
اس کی سرسبز پھیلتی جڑ نے
کچھ بڑھا دی ہے عمر کی ریکھا

Full moon
Peering Into
The half-built house
(H.F.Noyes)

نامکمل مکان کے اندر
لامکاں کی حدوں سے جھانکتا ہے
چودھویں رات کا مکمل چاند

خاور اعجاز

عرضِ تمنا

تمنائیں ترک کرنے کے لئے نہیں ہوتیں بہت خوبصورت ہوتی ہیں کہ جی چاہتا ہے میرا سر ہو تیرا در ہو میرا دل ہو تیرا گھر ہو دل کی بات کریں دل کی بات سنیں کچھ وہ سنائیں کچھ ہم سنائیں کچھ وہ سنیں جو کچھ دل میں ہے کہ ڈالیں وہ کہیں اور کہتے ہی رہیں آنکھ نہ جھپکیں سانس لینا بھول جائیں دل دھڑکنا بھول جائے کہ ارد گرد کی خبر ہی نہ ہو پتہ ہی نہ چلے کہ کتنا سمے بیت گیا کتنے زمانے زمین کا رزق ہوئے کتنے آنے والے آ گئے جانے والے چلے گئے اور چلتے گئے ہم ان کی باتوں میں اس قدر کھوئے کہ شب قدر ہو گئی اس قدر گم ہوئے کہ گم صم ہو گئے اس قدر گہرائی میں چلے گئے کہ سطحیت کا پتہ ہی کھو گیا۔

تمنا مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی عقل معترض نہ ہوئی دماغ کو پتہ ہی نہ چلا دل کو سنبھالے سنبھلتا ہی نہ تھا ہم نے سینے سے لگایا دل نہ اپنا بن سکا بس ایک لحظہ میں خلعت سلطانی حجتی ہی نہیں جن پر دل خدا ہوا ان کے سامنے سب کچھ لا کر رکھ دیا۔ میرا اک صاحب دل دوست تھا اللہ والوں کے پاس بیٹھتا تھا سنا کہ رب کو اس وقت تک پا نہیں سکتے جب تک اپنی عزیز ترین شے اس پر قربان نہ کر دو اچھا خاصا رئیس آدمی تھا محبتی تھا ایک ہی بیٹی تھی کہا تم دین کے لیے وقف ہو دین پڑھو گھر بار سنت کی حد تک رکھو اور لوگوں کو اللہ کی طرف بلاؤ گھر کا سارا سامان گلی میں لا کر رکھ دیا مستحقین کو بلایا اور کہا۔

،، جو چیز پسند ہو اٹھا کر لے جاؤ مجھ سے کہنے لگا

،، بس میرا ایمان کمزور تھا اس لیے ایک

سلیمان عبداللہ ڈار

چولہا اور ایک توا میں نے گھر میں رکھ لیا
سنت صدیقیؓ پوری کرنے کی کوشش کی پر نہ ہو سکی!
میں نے دلاسہ دیا
،، کہاں ہم کہاں وہ بس یوں سمجھ سنت صدیقؓ ادا ہو گئی۔
،،اس نے کہا
ہم نے انکے سامنے اوّل تو خنجر رکھ دیا
پھر کلیجہ رکھ دیا دل رکھ دیا سر رکھ دیا

یعنی جو چاہو قبول کر لو سب کچھ تم پر وار دیا ہے یہی عرض تمنا ہے یہی تمنا کی تمنا ہے۔ تمناؤں کا پیچھا کرنا ہوگا تب ہی منزل ملے گی ہاں مگر نہ ہی مقصود منزل ہے نہ ہی منزل مقصود ہے اصل تو چاہت والا رشتہ ہے وہ مل گیا تو سب کچھ مل گیا چلنا مقصود ہے پہنچنا مقصود نہیں چلتے رہیں اور اسے پیار آجائے وہ راضی ہو جائے تو وارے نیارے ہیں اور یہی سمجھتے رہیں کہ پہنچ گئے ہیں مگر وہ ناراض ہو تو پہنچنا نہیں ہوا۔ سارا راستہ ہی کھوٹا ہو گیا ساری چلت پھرت ہی بے کار ہو گئی (پھرت موسیقی کی زبان میں گلے سے بار بار علیحدہ مخرج کے ساتھ مصرعہ کا یک ہی لفظ کئی اشکال میں گایا جانا ہے مگر اس سے راستہ کٹتا نہیں یعنی غزل مکمل نہیں ہوتی)

عرض تمنا حب دل میں ابھرتی ہے تو فلک سے جواب آتے ہیں نالے سنے جاتے ہیں
اٹھتے ہی حجاب آخر دل ہولے سے کہتا ہے
ہولے سے سنتا ہے اک آواز سی آتی ہے
مدھر سی کانوں میں جلترنگ سے بج اٹھتے ہیں کہتے ہیں
میں غزنوی سوغات دل کا تو سراپا ایاز ہو جا
ایاز ہونا اور پھر سراپا ایاز ہونا اتنا آسان بھی نہیں دنیاوی خواہشات کو اس کے لئے کچلنا ہوگا دل کے سومنات پر ستر ہ حملے ہوں تو بھی یہ فتح ہونے میں نہیں آتا نہ ہی اس کا زنگ اترتا ہے نہ ہی اس میں سے سارا کاٹھ کباڑ باہر نکالا جا سکتا ہے۔
دنیا کبھی اس طرف سے خوف زدہ کرتی ہے کبھی اس طرف سے یہ کبھی رنج والم دل سے اسی وقت نکل سکتے ہیں جب زندگی میں صرف آپ رہ جائیں اور آپ کے پاس اللہ جل شانہ کی محبت رہ جائے پھر اندیشہ ہائے گونا گوں پاس بھی نہیں بھٹکے گا کہ دل نے کہا جو دیا وہ جیسا چاہے کرے اب دل میں کوئی گلہ باقی نہیں وہ اگر آسانی دے تو آسانی ہے ہی اگر مشکل دے تو اسی کی طرف سے آئی ہے یہ مشکل تو نہ ہوئی جس سے دل لگایا تھا اس کی طرف سے آئی ہے تو آسانی ہی ہے ٹھیک ہے تکلیف ہے مگر دیکھ نہیں شکوہ

نہیں شکایت بھی نہیں کہ وہ اگر اس طرح سے راضی ہے تو یونہی سہی عرض تمنا بھی تو یہی کرنا تھی کہ تجھے خوش رکھنا چاہتے ہیں اب مالک اگر آزمائش میں ڈال کر خوش ہے تو الحمدللہ خواہشات کا دینوی اک سلسلہ بنایا تھا کہ ایسا کریں گے یوں ہوگا مگر منصوبوں کا مینارہ دھڑام سے گر گیا تو مالک سے بسم اللہ یہ خواہشوں کا ٹوکرہ تیرے قدموں میں الٹ دیا اب جیسے تیری مرضی سرنیڈر کر گئے جو سوچا تھا جو چاہا تھا وہ نہیں ہوسکتا یہی تو تعلق کا حسن ہے تعلق ٹوٹنے نہ پائے مالک کے پاس صحت کے بے پناہ خزانے تھے مگر بیماری ہے کہ پچھلے 35 سال سے جان ہی نہیں چھوڑ رہی تو کوئی بات نہیں اگر اسے ایسا ہی پسند ہے تو پرانی بیماری اور اعضا کی لاچاری قوی کی کمزوری پر بھی سبحان اللہ کہ تو شان والا ہے میں ذلیل ہوں میری تو کوئی شان ہے ہی نہیں یہ ٹوٹی پھوٹی محبت پر شکستہ دلی یہ نرم گرم آنسو یہ تر دامنی یہ جھولی میں چھید ہی چھید ہیں تیرے سامنے پھیلائے ہوئے ہیں کہ تو نے خود ہی تو مجھے کہا تھا:

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

.....

بندے کی بھی اک حالت تو نہیں رہتی کبھی وہ کہتا ہے کہ اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں کہ کوئی رات سوز و ساز رومی میں گزر گئی کوئی رات پیچ و تاب رازی میں گزر گئی پھر بعض اوقات بندے کو پتہ چلتا ہے کہ وہ اثر کہن بھو مالک کی محبت کو چاہتے تھا وہ نہ ہی تیری حکایت سوز میں مل سکا نہ ہی میری حدیث گداز میں کہ میرے تیرے احوال ہی ایسے ہیں چار آٹھ آنے کی دوکانداری نوکری تجارت یا زراعت ہی سے فرصت نہیں تو سوز و ساز رومی کے لیے وقت کہاں سے نکلے گا اپنی گلیوں اور نالیوں پر غور و فکر کرنے کا ہی ہر روز رونا ہے تو اک آفاقی مقصد کہاں سے سامنے آئے گا تو عرض تمنا کریں گے۔

اک صاحب حال صاحب دل دوست احباب سے کہا کرتا تھا۔

،،اے بندے تیرا رب تجھے ہر وقت محبت سے دیکھ رہا ہے کیا تو نے بھی کبھی اس سے دل کی بات کی؟

یہ دل کی بات ہی عرض تمنا ہے اس تمنا کی تمنا دل میں پالتے رہیں تو اک روز محب کو محبوب ملے گا دنیادار کے دل میں اگر تمنا ہو گی بھی تو گلے شکوے سے شکایت اور تنقید ہی کی ہوگی محبت کی راہوں میں گلہ قابل تعزیز اور ناقابل معافی جرم ہے۔ معاذ اللہ اس کی سزا

رانده درگاه ہونے کی صورت بھی ہو سکتی ہے

میرا صاحب دل دوست اپنی العد بھی محبوں کے قصے سنایا کرتا تھا سردیوں کے دنوں میں کھیس کی بکل مار کر میں دوزانو ہو کر اس کی سرگوشیاں سنتا تو اک انجانا سا کیف و سرور ملتا وہ یاد کرتا جاتا اور ماضی کی حقیقی محبت کے قصے سناتا رہتا بتایا کرتا کہ دل ایسا نرم ہو گیا تھا کہ کوئی رب کی بات کرلے تو آنسوؤں کی جھڑی پر سینے کو تیار کھڑی ملتی۔ وہ کیسی سرشاری تھی بعض اوقات تو اسے قطعی طور پر نظر آتا کہ رب کریم میری صرف در پردہ ہی نہیں ظاہرا بھی مدد فرما رہے ہیں وہ جیسے دعا کرتا ویسے ہی حالات ہو جاتے پھر اسے کچھ مسائل کا سامنا ہوتا تو تھوڑا عرصہ قبل کی گئی دعا کے بالکل الٹ عرض تمنا کرتا تو بھی بالکل ویسے ہی نقشے اس کے سامنے آجاتے مگر یہ کیفیات ضروری نہیں کہ مسلسل اسی طرح طاری رہیں عموماً اپنی کمی یا کوتاہی کی وجہ سے یہ کیفیات رخصت ہو جاتی ہے اس لیے عرض تمنا کا ہنر آتا ہو تو بھی اس پر اترانا یا تکبر کرنا دوری کا باعث بھی ہو سکتا ہے میرے دوست کے دل سے اک لمبی ہوک سی اٹھتی وہ اک آہ بھر کے رہ جاتا اور کہتا:

،، افسوس کہ وہ حالات وہ سوز و گداز وہ راتوں کا جاگنا وہ اکیلے میں سسکیوں بھری باتیں اللہ جل شانہ سے کرنا رخصت ہو گیا،،

مگر کیوں،، میں حیرت زدہ ہو کر پوچھتا

وہ کہتا،، اس پر سوچا تو بہت ہے چاہا بھی بہت تھا کہ قربتیں فاصلوں میں تبدیل نہ ہوں مگر شاید اپنا ظرف ہی چھوٹا تھا اس میں حقیقی محبت سما ہی نہ سکی مالک تو اب بھی مہربان ہے بس ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات ! والا معاملہ ہو گیا ہو گا مالک کی محبت اور رحمت تو بارش کی طرح ہے اب آگے اپنا اپنا ظرف ہے گندمند پر ہوگی تو بدبو آئے گی گلشن میں ہوگی تو پھول کھلیں گے خوشبو سے فضا مہکے گی جو خوشبوئیں نصیبوں سے ملتی ہیں،،

عرض تمنا میں تاثیر ہوگی تو مالک نقد مدد کریں گے یعنی اسی وقت آج ہی ابھی عطا کریں گے چاہت فرض ہے طلب ہوگی تو تاثیر بھی عطا ہو جائے گی وہ محبت بھرا دل بھی عطا کرتا ہے اور تمنا بھی۔ گرتوں کو بھی تھام لیتا نہ چلنے والوں کو بھی چاہت کی راہ پر چلا دیتا ہے خود سے چاہیں محنت کریں مشقت کریں تو عرض تمنا کی وہ چاشنی حاصل نہیں کر سکتے جو اللہ جل شانہ چاہتے ہیں بس نصیبا ہو تو وہ سخاوت کرتے ہیں دیا لو مالک ہیں چاہیں تو دے دیں چاہیں تو نہ دیں

اکناں لبھدیاں لبھے ناہیں۔
اکناں نوں وچ راہیں

یعنی بہت سے ایسے ہیں کہ وہ تلاش کرتے رہتے ہیں پا نہیں سکتے اور کچھ ایسے ہیں جن کی کوئی ادا مالک کو بھا جائے تو راہ چلتے ہوؤں کو بھی دان کر دیتے ہیں۔

عرض تمنا میں جلد بازی کے بجائے انتظار ضروری ہے تحمل اور برداشت تمنا کی منزل کی پہلی سیڑھی ہے اور آخری رکاوٹ بھی!

ایڑیاں اٹھا کر نہ دیکھیں بس چپ منتظر رہیں التجائیں کرتے رہیں کہ یہی ہمارے ذمہ ہیں نتیجہ نہیں! یہاں انتظار بھی تو سرور اور کیف سے بھرا ہوا ہے راستے میں بے یقینی کی بہت سے آندھیاں چلیں گی استقلال محبت کی کشتی کا بادبان بنے گا تو عرض تمنا کی یہ کشتی ضرور اک نہ اک روز چاہت کے ظربیکراں کے ساحل کی بجائے محبت کی گہرائیوں میں لنگر انداز ہو گی خون صد ہزار انجم سے محبت کی سحر پیدا ہوتی ہے تمناؤں کی رات کے نصیب میں محبوب کی رضا کا سورج ازل سے لکھا جا چکا ہے ہمت والوں کو یہ صبح یہ سورج نظر آتا کو ہیں اور تھوڑ دلے راستے ہی میں لغزش پا کا شکار ہو جاتے ہیں چاہت حجاب اٹھواتی ہے۔ ہمیں اپنے اندر سے آشنا کرواتی ہے طلب کی خواہش نگاہ کی محتاج ہوتی عقابی نگاہ ایک ہی خواہش کو سو سو طور پر سو سو رنگ میں پیش یہ سوچ کر کہ نہ جانے کون سا رنگ مالک کو بھا جائے یہ ضروری تو نہیں تمہید طولانی ہو اس بارگاہ میں خاموشی ہی گفتگو ہے یہاں کا نہ چاہنا ہی عین چاہنا ہے یہاں کا نہ ہونا ہی عین ہونا ہے۔ یہاں کی گدائی ہی بادشاہی ہے چاکری ہی سروری ہے یہاں کی بظاہر مصیبت نظر آنے والی ہی عظمت ہے عزت ہے یہاں کا سادہ لباس خلعت سلطانی سے کہیں بہتر بلکہ اولیٰ تر ہے۔ عرض تمنا میں جتنا خلوص جس قدر کھرا پن اور جتنی وارفتگی ہوگی اسی قدر یہ سنی جائے گی ۔یوں تو بارگاہ الٰہی کسی بھی آواز کی بے قدری نہیں ہوتی مگر محبت بھری آوازوں کی ذاتی قرب سے نوازا جاتا ہے یعنی محدود کو یہی تمنا لامحدود سے ملاتی ہے اور دل کی آنکھوں سے ایسا دیدار کرواتی ہے کہ صحابہؓ فرمایا کرتے تھے جنت اپنی تمام تر خوبصورتیوں اور جہنم اپنی اصلی شکل میں سامنے آجائے تو بھی یقین میں رتی برابر اضافہ نہیں ہوگا کہ یقین اور تمنا ایک خزانہ ہیں اور یہ خزانہ کہاں چھپا ہوا ہے؟ دل میں!

کیا کبھی میں نے کیا کبھی آپ نے دل کی آواز سنی؟

☆☆☆☆☆

کفن پوش

اگر تم سمجھتے ہو کہ مجھے افسانہ لکھنا نہیں آتا اور میری طرف سے بھیجے گئے مسودے کا غذ کے فضول ٹکڑے ہیں تو یہ تمھاری بھول ہے --- بوڑھے نے اپنے سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص سے قدرے درشت لہجے میں کہا اور جیب سے سگریٹ نکال کر کانپتے ہاتھوں سے ماچس جلانے کی ناکام کوشش کرنے لگا---

سامنے بیٹھا آدمی کچھ دیر اس ناکام کوشش کو دیکھتے رہنے کے بعد اپنی کرسی سے اٹھا اور اس کی انگلیوں کے درمیان اڑسے سگریٹ کو اپنے لائٹر سے سلگاتے ہوئے بولا --

خلجی تو بے وجہ غصہ کر رہا ہے --- تیرے افسانے ہر طرح سے مکمل افسانے ہیں لیکن--- لیکن ---- لیکن کیا ---- خلجی ایک بار قدرے اونچی آواز سے بولا---

ہماری پالیسی --- سامنے بیٹھا شخص جو شائد اس جریدے کا مدیر تھا اپنی آواز کو دھیما رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا

تیس سال ہو گئے اس ادارے سے وابستگی کے --- خلجی ایک بار پھر گویا ہوا------ مجھ سے بہتر کون سمجھتا ہے اس ادارے کی پالیسی کو --- ایک طویل عرصے تک میں اس ادارے کے اخبار میں کرائم رپورٹر کی حیثیت سے کام کرتا رہا ----ایک مدت تک میں نے اسی ادارے کے اخبار میں کالم لکھے ---اور آج اسی ادارے کے ایک جریدے کا ایڈیٹر مجھے اس ادارے کی پالیسی سمجھا رہا ہے--وہ لفظوں کو چباتے ہوئے بہت دیر تک اپنی ادارے سے وابستگی اور پچھلی کچھ دہائیوں سے ادارے کی پالیسی پر بات کرتا رہا

سامنے بیٹھا شخص کافی دیر چپ رہنے کے بعد ایک بار پھر گویا ہوا-------- خلجی جرائم کی رپورٹنگ اور افسانے کے خدوخال میں بہت فرق ہوتا ہے--- جرم کسی بھی نوعیت کا ہو سکتا ہے، مجرم اخلاق سے گری ہوئی کوئی بھی حرکت کر سکتا ہے، اسے اپنے وقار اور مذہبی احکامات کی پرواہ نہیں ہوتی اور وہ اپنے انجام سے بھی بے خبر ہوتا ہے- لیکن میرے پیارے دوست-- کسی بھی ادبی مجلّے کے لیے مجرمانہ پالیسی اپنانا ممکن نہیں- ادارے کو اپنے اقدار اور رسم و رواج

حبیب الرحمٰن

کا خیال بھی رکھنا ہوتا ہے اور ادارہ کسی بھی طرح یہ نہیں چاہتا کہ وہ کسی بھی طرح گناہ اور جرم کی ترغیب دے -----

صدیقی--- خلجی پہلی دفعہ سامنے بیٹھے مدیر کا نام لے کر مخاطب ہوتے ہوئے بولا--- تجھے مجھ سے چڑ ہے -- حسد کرتا ہے تو مجھ سے -- تجھے ڈر ہے کہ میرا نام بحیثیت افسانہ نگار جانا نہ جانے لگے--- یہی افسانے اگر میں شکنتلا دیوی کے نام سے بھیجوں تو تیری ساری پالیسی بھاڑ میں چلی جائے گی اور افسانہ چھپ بھی جائے گا--- افسانہ ایک طرف رکھ کے تو تیس سال کے تعلق کا لحاظ ہی کر لے --- خلجی بہت دیر تک پتہ نہیں کیا کیا بولتا رہا اور سامنے بیٹھا شخص جسے خلجی صدیقی کے نام سے پکار رہا تھا پاس پڑے فائلوں کے ڈھیر سے مختلف کاغذات علیحدہ کرتا رہا -----

خلجی تیرے کچھ افسانے میرے سامنے ہیں ----- صدیقی نے خلجی کی گفتگو نظر انداز کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا----- ہم بحث نہیں کریں گے ہم تیرے بھیجے گئے چند افسانوں پر بات کریں گے اگر تم نے مجھے قائل کر لیا تو میرا وعدہ ہے تیرے افسانے اسی جریدے میں چھپیں گے لیکن اگر تو اپنے دلائل سے مجھے غلط ثابت نہ کر سکا تو یہ بحث ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔

--- خلجی نے کوئی جواب نہ دیا اور ایش ٹرے میں سگریٹ مسلتے ہوئے صدیقی کو اپنی آنکھوں سے بات جاری رکھنے کا کہا--

صدیقی نے اس کے پہلے افسانے کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے اپنی بات دوبارہ شروع کی --- تیرا بھیجا ہوا پہلا افسانہ میرے سامنے ہے بھائی کے ہاتھوں بھائی کے قتل کی کہانی کا نام-- رقیب-- سمجھ سے بالاتر اور اخلاقی گراوٹ کا آئینہ دار محسوس ہوتا ہے۔

خلجی افسانے کے نام پر ہونے والی اس غیر متوقع تنقید پر سیخ پا تو ہوا لیکن بولا نہیں-- صدیقی نے پل بھر سلگتے ہوئے خلجی کو دیکھا اور پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا-- کرائم سٹوری کے حساب سے ہو سکتا ہے کہ یہ ایک اچھی ریٹنگ والی کہانی ہو لیکن بھابی سے شادی کے لیے بھائی کی جان لینے کی کہانی ہمارے اقدار کے خلاف ہے اور ہماری پالیسی کے خلاف بھی---

یہ سچی کہانی ہے--- خلجی چڑتے ہوئے بولا ہر سچی کہانی افسانہ نہیں ہوا کرتی -- صدیقی جواب دیتے ہوئے بولا ----- کہانی کے انجام پر ہیرو جسے ولن ہونا چاہیے تھا باعزت بری ہو کر اپنی بھابی سے شادی کر لیتا ہے ------ خلجی ہمارا ادارہ ظلم کی فتح اور برے کو کامیاب بنانے کی کسی کہانی کو پروموٹ نہیں کر سکتا-- یہ اخبار نہیں ہے اور نہ ہی تم کرائم رپورٹر ہو--- افسانہ ایک مختلف صنف ہے اور اسے ہمیں ہر افسانے کو اپنے ادارے کی پالیسی کے مطابق بھی جانچنا ہوتا ہے۔

پالیسی --- صدیقی کی طرف سے منگوائی

گئی چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے خلجی دھیرے سے بولا-- تم ایک ہی بار میرے بھیجے گئے دو چار افسانوں کی بات کر لو میں بار بار اپنا بلڈ پریشر ہائی نہیں کر سکتا --

صدیقی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اگلا افسانہ میز پر دھرتے ہوئے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا -- ہمارا جریدہ ایک ادبی جریدہ ہے اور تم نے ملکی سیاست سمیت عالمی معاملات، امریکہ اسرائیل تعلقات سے لے کر کشمیر فلسطین سب کچھ ایک ہی کہانی میں گھسیڑ دیا ہے- تمھارے اس افسانے کے ہیرو اور ہیروئن سے شدت پسندی کی بو آتی ہے جسے ہمارا ادارہ کسی بھی صورت قبول نہیں کر سکتا --

کیا یہ افسانہ تکنیک کے لحاظ سے مکمل افسانہ نہیں-- خلجی کھنکارتے ہوئے بولا

یہ میں نے کب کہا-- صدیقی دھیرے سے بولا --- افسانہ اس خوبصورتی کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ بعض اوقات یوں لگتا ہے جیسے ایک فلم ہے جو سامنے چل رہی ہے کہانی کی بنت اور منظر نگاری اتنی جاندار ہے کہ کئی بار قاری خود کو کشمیر کی وادی اور لبنان کے زیر تسلط علاقوں میں ہیرو کے ساتھ ساتھ چلتا پھرتا محسوس کرتا ہے- اتنے گمبھیر موضوع پر شائد ہی آج تک کسی نے قلم اٹھایا ہو اور شائد ہی اس خوبصورتی سے ان مسائل کو اجاگر کیا ہو جو سب کے سامنے تو ہیں لیکن کوئی بھی ان پر کھل کر بات نہیں کرتا--

پھر --- خلجی جیب میں کھلے سگریٹ کو ٹٹولتے ہوئے بولا-

پھر --- صدیقی مسکراتے ہوئے بولا --- سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ہمارا ادارہ اس افسانے کو نہیں چھاپ سکتا کیونکہ یہ افسانہ ہماری پالیسی کے خلاف ہے

اس افسانے میں کچھ بھی غیر اخلاقی نہیں ---اس میں اجاگر کیے گئے مسائل ہماری سرکاری قومی پالیسی سے متصادم نہیں --

خلجی کا لہجہ پھر کچھ تلخ ہونا شروع ہو گیا-

سب کچھ ٹھیک ہے خلجی --- یہ کہیں بھی چھپ جائے گا لیکن ہمیں یہ رسالہ ہمیں ساری دنیا میں بیچنا ہوتا ہے اور ہم اپنے گھر کو خوش کرتے کرتے ساری دنیا کو ناراض نہیں کر سکتے-

خلجی کا پارہ ایک بار پھر چڑھا لیکن وہ ضبط کر کے رہ گیا-

اس کا اور صدیقی کا تعلق تیس سال پرانا تھا- وہ اور صدیقی تقریباً ایک ہی وقت کراچی وارد ہوئے اور دونوں نے ایک ہی ادارے کے اخبار میں ملازمت اختیار کی- یہ الگ بات کہ صدیقی دھیمے مزاج کا مالک اور دفتری امور کا ماہر سمجھا جاتا جبکہ خلجی تھوڑے تیز مزاج کے ساتھ فیلڈ میں کام پسند کرتا- صدیقی خوش نویس سے پروف ریڈر ہوتا ہوا نیوز ایڈیٹر بنا اور پھر ایسے ہی ترقی کرتے ہوئے ادارے کے ادبی رسالے کا مدیر بن گیا- صدیقی فطری طور پر کسی بھی شخص کو ناراض نہیں کر سکتا تھا اور شائد یہی وجہ تھی کہ افسانوں کی اشاعت کے سلسلے میں کوئی مثبت قدم نہ اٹھانے

کے باوجود وہ کسی بھی طرح خلجی کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔

خلجی --- صدیقی اپنی آواز دھیمی رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا-- تمھارا افسانہ کنجری اب میرے سامنے ہے -- یوں تو اس کا نام ہی ہماری پالیسی کے خلاف ہے لیکن میں اس افسانے پر پھر بھی تم سے بات کرنے سے انکار نہیں کروں گا---

پنجابی طوائف کے لیے اس سے بہتر کوئی لفظ اگر آپ کی نظر میں ہے تو بتا دیجیے-- خلجی نے کھنکارتے ہوئے کہا

صدیقی نے بغیر جواب دیئے اپنی بات جاری رکھی --- کہانی کا نام ایک جانب کہانی کی بنت میں آپ نے منٹو کو بھی مات دے دی ہے ---

منٹو کو مات دینا دکھ کی بات ہے یا فخر کی -- خلجی صاحب ایک بار پھر گویا ہوا--

میرا یہ مطلب ہرگز نہیں اور نہ میں افسانے کے معیار اور کہانی کی بات کر رہا ہوں---- میں تو کہانی کی ہیروئن کے لباس کی تراش خراش بلکہ یوں کہنا چاہیے لباس کے اس پار جسم کے خطوط اور ایک ایک انگ پر تمھاری گہری نظر اور اس کا اپنی کہانی میں تفصیلی ذکر کی بات کر رہا ہوں جسے پڑھ کر اس عمر میں بھی کان کی لویں سرخ ہو جاتی ہیں---

بازار حسن کی ایک طوائف کے بارے میں کچھ بھی لکھے جانے والے ایک افسانے میں آپ مجھ سے کس طرح کی امید رکھتے ہیں اور اگر اس عمر میں بھی یہ تصویر کشی آپ کی دھڑکن تیز کرتی ہے تو کم از کم یہ طے کر لیں کہ میرے لکھے میں جان ہے---

تیرے لکھے میں بہت جان ہے خلجی لیکن تو شائد میری بات سمجھ نہیں رہا --- صدیقی نے ایک بار پھر اپنی بات شروع کی --- تیری کہانی میں کوئی مسئلہ نہیں تجھے لکھنا آتا ہے تیرا مطالعہ بہت وسیع ہے تو کہیں بھی لکھے چھپ جائے گا لیکن --- یار ہماری پالیسی --- صدیقی ایک بار پھر رک کر سامنے پڑے ہوئے ایک اور افسانے پر بات شروع کرنے ہی والا تھا کہ سامنے بیٹھے خلجی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا

رہنے دے صدیقی --- خلجی تلخی سے بولا --- مجھے سمجھ آ گئی ہے -- تیرا جریدہ جیتے جاگتے زندگی سے بھرپور افسانوں کا مسکن نہیں یتیم مسکین نہیں گونگے بہرے لولے لنگڑے افسانوں کا گھر ہے - تیرے جریدے کو افسانے نہیں بے یار و مددگار کہانیاں چاہئیں جن کا مقدر تیرے رسالے کی پالیسی کے کفن میں لپٹ کر اسی رسالے کی قبر میں دفن ہونا ہے--

صدیقی تو اس جریدے کا مدیر نہیں گورکن ہے -- گورکن --- خلجی غصے سے کہتے ہوئے اٹھا اور باہر نکلتے ہوئے سر جھکائے میز کے پار بیٹھے صدیقی کو دیکھنے لگا جسے ابھی جانے اور کتنے مردے دفن کرنے تھے--

☆☆☆☆☆☆

"بندہ سُراب ہے؟"

میں وفا کی اُس دھرتی کی نساء ہوں جہاں دلبر کے مرنے کے بعد دلرُبا کو ستی کر دیا جاتا تھا یا وہ از خود ستّی جیتی ہے۔ وفا میں حد سے گزرنا اس جغرافیے کی عورت کے رگ وپے میں کم یا بیش ہے۔

اے مِٹ جانے والے

تم تو یک بار مٹ گئے میں برابر مِٹ رہی ہوں۔

ابھی تو ہزاروں باتیں کرنا تھیں، اب مجھے خود سے بولنے کی عادت ہو رہی ہے۔ بولنا عورت سے جُڑا لطیفہ ہے ہر لطیفے میں رائی جتنی ہی سہی صداقت تو ہوتی ہے۔ عورت اپنے محبوب سے ہر احساس کی حصہ داری کر کے چین پاتی ہے۔ کتنا بے مول ہے اس جانی کا انمول سکھ......عورت کا محبوب جسمانی قربت و کشش سے مشروط نہیں ہوتا (یہ محبوب ماں/بیٹا/بیٹی بھی ہو سکتی ہے)

باہر کے شور نے ہماری سرگوشیوں کو نگل لیا۔

باہر تو سب ملمع ہے - میں نہ تمھارے دائیں پہلو تھی نہ بائیں پہلو۔ دور کے کونے میں تب بھی تھی اب بھی ہوں۔ ہمیں پتا ہی نہیں ہوتا ہماری حیاتی کا سنہرا دور کون سا ہے۔ ہم اُسے یونہی سا بِتا دیتے ہیں۔ اپنا کافی کا کپ کام کاج کرتے خالی کر دیتے ہیں۔ ہم اسے تشکر کے رواں لہو میں نہیں گھولتے۔

چہکتی چڑیا کب خاموش ہو جائے گی، کوُکتی کوئل کب ہجرت کر جائے ہمارا تو ادراک خاموشی اور ہجرت کے بعد ہوتا ہے۔

وہ میرا سنہرا دور تھا۔

جب میں اسناد کی ایک فائل لیے ایجوکیشن آفس کے کمرے میں بڑی کھڑکی کے پاس اس لیے کھڑی تھی کہ کمرے کی ہر کُرسی درخواست گزاروں سے پُر تھی۔ ہاں اُس وقت گرمی تھی۔ انتظار کی طوالت ظاہر تھی۔ کامیابی کی شمع جلتی بجھتی تھی۔

مگر

کمرے میں موجود آنکھیں مجھ پر ایک بار پڑتی تو بار بار دیکھتی۔ کھڑکی کے کتھئی شیشوں میں Keets کی حسینہ کا عکس تھا۔

دردانہ نوشین خان

ابھی پچھلے دنوں La belle Dam Sans mercy کی تشریح کا مطالعہ کیا تھا۔ فائل لیتے ہوئے لیڈی کلرک نے میرے غیر معمولی خوبصورت ہاتھ کو ٹھہر کے دیکھا تھا۔ اور کوئی تعریفی کلمات کہے تھے۔

پانی پلانے والی نے میٹھے لہجے کہا۔

"پانی پیو گی بیٹی۔"

حُسن، اوپر والے کی خیرات کے اضافی کلواع (پیمانہ) ہے۔ سُندرتا کی کوتاہی کی سرزنش میں بھی شہد گھلی ہوتی ہے۔ ہفتم جماعت میں ایک گوری چٹی تیکھے نقوش کی لڑکی تھی نام تو اُس کا کچھ اور تھا، استانیاں اُسے "ملکہ صاحبہ" کہہ کر ڈانٹتی تو ڈانٹ کے تیور میں مسکان بھر جاتی۔ میں سوچتی ہوں جنت میں حسن ملا بھی تو کیا؟ ہر سمت مہ جبیں، مہوش، ماہ لقا، مہ رُو، مہ پارہ صورتیں ہوں گی۔ حسن اگر ستائش نہ جگائے تو خاک حسن ہے۔ نہ کوئی بلائیں لے نہ نظر اُتارے۔

ہاں..... جب یہ اضافی کلواع واپس لے لیا جاتا ہے۔ تو مفت خور کو چوٹ گہری لگتی ہے۔ یہ چوٹ سکھاتی ہے کہ توجہ کو حسن کا حق بنانا عدل نہیں۔

میں بات کر رہی تھی سنہرے دور کی۔ ہاں اُس وقت گرمی تھی، انتظار کی طوالت تھی، واپسی کا محدود کرایہ تھا اور تب یہ سب سے بڑا قلق تھا حالانکہ گھر پہ سائبان تھا، دعاؤں میں اُٹھے ہاتھ تھے۔ محبتوں کے دسترخوان تھے۔ اور اب؟

سائبان گئے، مہربان گئے، حُسن گیا۔ چمک گئی، دمک گئی، زندگی کی ہر رمق گئی، ہجوم سارا چھٹ گیا، لکھوں کھک ہو گئی (لاکھ سے تنکا ہو گئی) قلق اس کو کہتے ہیں۔

اے چھپ جانے والے!

میری منطقی موشگفیاں تو وہی کے وہی ہیں۔ تم نے اب زندگی کے بارے کیا سوچا؟ زندگی یہ تھی یا وہ ہے؟

ارضی دانش مندیاں طفلانہ ہوتی ہیں۔ سکے کے ایک طرف دیکھنے والا بے چارا انسان، قید میں بند ایک ہی رسی کو گرہیں لگانے اور پھر کھولنے میں مصروف، جس کی گنتی ناپ تول کر محدود، دید شُنید دل و دماغ کی دوڑ محدود ہے مگر سمجھتا اپنی کھوج کو حتمی ہے۔

اور ہم تو لفظوں میں ملے اور لفظوں میں بچھڑ گئے۔

سڑک کنارے گھاس کے قطعے پر بیٹھے ہوئے میں نے دیکھا۔ سکول وردی میں چھوٹی بچی چڑیا کا مرا ہوا بچہ مٹی میں دباتے ہوئے روئے جاتی، بڑی بچی (غالباً اُس کی بہن) گا کر اُسے چھیڑتی

ترے جانے کا غم
پھر نہ آنے کا غم
اور زمانے کا غم.....

نہ کرو بچو..... نہ کہو ایسے..... پھر نہ آنے کا غم بہت بڑا ہوتا ہے۔ جانے کے بعد آنا سو تو غم نہیں انتظار ہوتا ہے کبھی نہ آنے کا اندوہ کیجیے

پہ چٹان بن جاتا ہے۔ اور وہ غم جو زمانے کے سامنے منایا نہ جا سکے وہ اندر کا ناسور ہوتا ہے۔ دل درد ہے، دل اضطراب ہے، دل گھٹن ہے، دل بے قرار ہے، دل تلاش ہے، دل اُداس ہے،

اے خوشبو، سکون، تازہ ہواؤں والے ربّ! ترے مٹی کے کھلونوں کو درد اچھا نہیں لگتا۔ یہ جسم کے بُت کو توڑتا پھوڑتا ہے۔ جوڑ جوڑ پیتا ہے اذیّت دیتا ہے۔ ہر درد میں تڑپنے والا میرا درد بڑھا دیتا ہے۔ میں اتنے درد ان لاغر ہاتھوں سے نہیں چُن سکتی درد گندا ہوتا ہے تو اسے نابود کر دے ناں..... میں ٹھنڈی چاندنی میں چل پڑتی ہوں۔ آجاؤ چھپ جانے، گم ہو جانے، مٹ جانے والو..... میں تمھارے ہی قبیلے کی ہوں۔ آؤ۔ ہم اپنی گلیاں بچا لیتے ہیں، اپنے محلّے کوچے لوٹا لاتے ہیں۔

ہم آواز لگائیں گے تو در و دیوار بول پڑیں گے بند مکان آنکھیں کھول دیں گے۔ کمرہ در کمرہ زندگی جاگتی چلی جائے گی۔

اے ارض وسما کے خالق!

گناہوں کے سرزد کا سبب عدم ایمان نہیں ہوتا۔ لوبھ، لالچ اور نفس شاہی سراسر نادانی..... بچارہ شوداگناہ گار، اب کوئی چارہ نہیں، نہیں بجز معافی یہ داغ داغدار نہیں دھو سکتا اسے صرف رحمت کی بارش دھوتی ہے..... بندہ بچارا اپنا پیارا کھونے پہ روتا ہے۔ کوئی اشکوں سے ڈائریاں لکھتا ہے کوئی دیوان ..... مگر بالآخر دیوان تلف، قلم دان تلف، انسان تلف۔

دلاسہ دیتے ہیں یہ کہنے والے کہ کسی کی موت پہ غم بے معنی ہے کیونکہ ہر سانس کے ساتھ ہم سب اُسی سمت گامزن ہیں۔ دلاسہ سچ ہے دلاسہ حق ہے، مگر..... غم ہوتا ہے۔

غم پھر بھی ہوتا ہے۔ ہم اپنی مقرر شدہ آوازوں، تعلق داریوں اور صورتوں کے عادی ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی کے نکل جانے سے خلا خود ہمارے اندر پڑتا ہے۔

بے شک خلا ضرور پُر ہوتا ہے لیکن وقت لیتا ہے۔ ہر وابستگی کا وقت پیمانہ جُدا ہوتا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ تمھاری وابستگی کا پیمانہ پورا ہوا تو مجھے بے وفا نہ کہنا، دُکھ کا کھوٹا بھی دکھ ہے، میری جھولی میں دُکھ کا وزن کبھی ختم نہیں ہوتا۔ نوعیت بدلتی ہے۔

سبز روش پر قدم ملا کے چلنا، بے تکان بولنا، بے جواز ہنسنا، برفانی پہاڑوں کے سرد لمس کا سفر کرنا، بے مزہ کھا کے مزہ کرنا، کتب خانے کی دری پہ سر جوڑ کے بیٹھنا بھاری بھرکم کتابوں کی پرتیں کھولنا، ایک قلمدان کی روشنائی سے اپنے اپنے اوراق کو مزین کرنا، چشم روشن دل شاد کرنا.....

نہ ہوا.....

نہ ہوا تو اچھا ہوا۔

اچھا ہوا ناں؟ مصلحت شناسی کے بعد ہی یہ

نتیجہ قبول ہوتا ہے۔ پتے کی بات بتاؤں
اے میرے مرحوم دوست!
زمین پہ انسان جوں جوں پرانا ہوتا جاتا ہے
خالق، زمانے کے رنگوں کو اس سے اُٹھاتا جاتا
ہے۔ زمان مکاں یعنی یہ والا جہاں نئے انسان
کا تحفہ ہے - بارش، بادل، موسم، سیریں،
لذتیں۔ نئے انسانوں کے لیے جاری رہتی
ہیں۔ نخلِ نوان میں اپنی خوشی اپنی حیرت اپنی
معنویت تلاش کرنے لگتا ہے یعنی کھلونے وہی
کے وہی ہوتے ہیں کھیلنے والے بچے بدلتے
رہتے ہیں وہ ان کو نیا کھیل دیتے ہیں۔
پُرانے انسان کا جذبوں، ملاحتوں،
ذائقوں، طرح داریوں سے واسطہ گھٹتا گھٹتا
معدوم ہو جاتا ہے۔
کیا سمجھے؟
رمز سمجھ جاؤ تو پھینکے جانے سے پہلے خود اُتار
پھینکو دھکیلے جانے سے پہلے کنارہ کر لو۔
میں سوچتی ہوں یہ آواز کیا چیز ہوتی ہے؟
آواز صرف سنائی ہی نہیں دیتی یہ دکھائی بھی
دیتی ہے۔
آواز سچائی کا راز کھولتی ہے، آواز رگ جان
ہے، آواز ہے تو بندہ ہے۔ آواز کے اندر
پورے کا پورا بندہ ہے۔ روح جسم، دل،
دھڑکن سب کا اظہار آواز ہے۔
خوف کے اندھیرے میں ہر بچے کی ایک ہی
چیخ ہے۔
''بولیں امّی..... آپ بولتی ہیں.....''
کھو دینے کے عفریت تلے ہاتھ پاؤں
مارتی ایک ہی استدعا.....
''بولو..... آواز دو۔''
جب صدیوں کی آوازیں محفوظ رکھنے کی
سائنس آئی تو کمال ہو گیا سلام ہے اس
سائنس کو جو گم شدہ فنا شدہ آوازوں کی سانس
ہماری سماعتوں میں زندہ کر دیتی ہے۔
آہ، ان تھک خود کلامی کے بعد پھر وہی
خاموشی دھارس دیتی ہے بولنا زمینی
ضرورت ہے خاموشی آفاقی حقیقت ہے۔
اللہ خاموشی کی زبان میں بولتا ہے ہر کوئی سُنتا
ہے یقین رکھتا ہے۔
وہ جب بولے گا تو انسانوں جانداروں کو
چپ لگ جائے گی۔ کائنات بھر کی بولتی بند
ہو جائے گی۔
پھر ساتویں جہت میں بھی تُو ہی تھا سامنے
لو ہم ہی مان لیتے ہیں بندہ سُراب ہے

.....

بندہ کیسا سراب ہے جس کی گویائی کے ہر لفظ،
عضو کی ہر جنبش اور ذرہ برابر سوچ کو غلطیوں
سے مبرا پیمانوں سے گزارا جا رہا ہے۔
حاصل کلام یہ ہے کہ اِدھر تو غور و فکر ادھورا
ہے۔ ہر کوئی نامکمل ہے۔
کیا ہر کہانی وہی جا کے مکمل ہوتی ہے؟؟

☆☆☆☆☆

لاوارث

دارالامان کے ایک کمرے سے رونے کی آوازیں آئیں تو خاتون انچارج نے فوراً اپنی چپڑاسی کو بھیج کر صورت حال سے آگاہی چاہی ،ملازمہ نے آکر بتایا آج دوپہر کو فیصل آباد سے بھاگ کر آنے والی شبانہ زارو قطار رو رہی ہے اور اس کے اردگرد دوسری لڑکیاں بیٹھی اس کا مذاق اڑا رہی ہیں۔

انچارج زبیدہ اپنی کرسی سے اٹھی اور جلدی سے وہاں پہنچ گئی لیکن اس نے صورت حال کا جائزہ لینے کیلئے فوراً کمرے میں داخل ہونا مناسب نہیں سمجھا، دروازے کی اوٹ سے اندر جھانکا تو عجیب رقت آمیز منظر تھا ''شبانہ'' کو تقریباً دس بارہ لڑکیوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا -باری باری لڑکیاں سوالات کرتیں اور پھر شبانہ کے جواب پر کچھ بے تحاشا ہنستیں اور چند رونا شروع کر دیتیں انچارج زبیدہ تھوڑی دیر کھڑی یہ کارروائی چھپ کر دیکھتی رہی پھر اچانک گرجدار آواز کے ساتھ بولی ''کیا ہو رہا ہے یہ؟؟؟''

لڑکیاں ایسے ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئیں جیسے کسی مرغیوں کے ڈربے میں خونخوار بلا آگھسا ہو، پھر آنکھیں چراتے ہوئے باری باری وہاں سے نکل گئیں نہ کسی نے جواب دیا اور نہ ہی زبیدہ نے کسی کو زبردستی روکا، اس لئے کہ وہ گذشتہ دس سال سے ایسے منظر نہ صرف دیکھ بلکہ برداشت کر رہی تھی اس نے آگے بڑھ کر ''شبانہ'' سے پوچھا' کیا ہوا؟ تمہیں کسی نے کچھ کہا؟

شبانہ نے منہ بسورتے ہوئے جواب دیا ''جی نہیں'' وہ تو میری کہانی سن رہی تھیں

زبیدہ نے گھورتے ہوئے کہا' بس اَب تم یہاں آ گئی ہو پچھلی کہانیاں بھول جاؤ، یہ لڑکیاں بہت چالاک ہیں میری ناک میں دم کر رکھا ہے اگر تم اسی طرح کہانیاں سناتی رہی تو یہ تمہیں ''کھلونا'' بنا لیں گی وقت گزاری کیلئے۔ اچانک اس کی نظر مہناز پر پڑی تو پھر غصے میں بولی ''اور تم یہاں کیا

ناصر نقوی

کر رہی ہو؟؟؟"

مہناز نے جواب دیا' میڈم میں اس کی "رومیٹ" ہوں۔

زبیدہ بولی' سوری مجھے یاد نہیں رہا۔ غصے میں اکثر بھول جاتی ہوں۔ اچھا سنو۔ تم سینئر ہو، شبانہ کا خیال رکھنا، کہہ رہی ہے کہ ایک دو روز میں اسے کوئی نہ کوئی لینے ضرور آ جائے گا

مہناز نے جواب دیا' میرا بھی یہی خیال تھا چھ مہینے ہو گئے کسی نے پوچھا تک نہیں، میڈم جی۔ میری خوش فہمی تو نکل گئی اس کی بھی ایک دو مہینے میں نکل جائے گی۔۔۔

شبانہ۔ ایک دو مہینے نہیں میں تو ایک دو ہفتے بھی نہیں گزار سکتی، میں مر جاؤں گی!!!

زبیدہ نے سخت لہجے میں جواب دیا' اوئے شبانہ اعظمیٰ ایویں یہاں کوئی چن نہ چڑھانا ورنہ الٹا لٹکا کر وہ حال کروں گی کہ نانی یاد آ جائے گی۔ یہ دارالامان ہے یہاں آنے کے بہت سے راستے ہیں لیکن جانے کا راستہ صرف ایک ہے اور وہ بھی میرے دستخط کے بغیر استعمال نہیں ہو سکتا

شبانہ نے ڈرے اور سہمے لہجے میں پوچھا' کیا اب میں اپنی مرضی سے کہیں نہیں جا سکتی؟

زبیدہ۔ یہاں کسی کی مرضی نہیں چلتی، اصول اور ضابطے ہیں اگر اس کی پرواہ نہیں کروں گی تو "سزا" ملے گی

شبانہ نے پوچھا "کیا میں قیدی ہوں"

زبیدہ نے جواب دیا' قیدی نہیں لیکن پھر بھی اپنے آپ کو قیدی ہی سمجھو، جو لڑکیاں گھر کی چار دیواری پھاند کر فرار ہوتی ہیں ان کا کوئی والی وارث نہیں ہوتا نہ ہی انہیں کوئی اپناتا ہے یہ "پت جھڑ" کے پتوں کی طرح زمانے کی ہوا کی محتاج ہو جاتی ہیں شکر کرو، تمہیں دارالامان کی چار دیواری میں پناہ مل گئی ورنہ ہمارے معاشرتی بھیڑیوں نے تمہاری "تکہ بوٹی" کر دینی تھی

شبانہ بولی' آپ مجھے حوصلہ دینے کی بجائے ڈرا رہی ہیں؟؟؟

ڈرا نہیں رہی سمجھا رہی ہوں، یہ جو چپ چاپ تمہارے پہلو میں دبکی بیٹھی ہے میرے جانے کے بعد اس سے پوچھ لینا کہ اس "چار دیواری" کی قیمت کیا ہے؟ یاد رکھو صرف پہلی رات مہمان ہو اس کے بعد تمہیں بھی سارے کام کرنے ہونگے ڈیوٹیاں لگتی ہیں یہاں، باری باری ہانڈی روٹی بھی کرنا پڑتی ہے یہ جو تیرے ساتھ معصوم سی مہناز بیٹھی ہے پہلے روز تو اس کے نخرے ہی مان نہیں تھے اب دیکھو کیسی یہاں کے رنگ میں رنگ گئی ہے صرف چھ ماہ لگے ہیں۔

شبانہ نے حیرانی سے پوچھا "چھ ماہ؟؟؟"

مجھے تو کل ہی میرا پرویز عدالتی حکم سے نکلوا کر لے جائے گا

زبیدہ بولی' مہناز کا "دلدار" تو آج تک نہیں آیا تیرا پرویز کل ہی آ جائے گا یہاں آنے والی ہر لڑکی کا یہی دعویٰ ہوتا ہے لیکن آتا کوئی

نہیں،،، دارالامان تو آباد ہی تمہاری جیسی خوابوں خیالوں میں اڑتی تتلیوں کیوجہ سے ہے سب گناہ گار ہیں کچھ بھگائے میں آئے ہیں اور کچھ شوقیہ فنکار، اچھی بھلی زندگی چھوڑ کر اپنی غلطیوں کی سزا بھگت رہی ہیں۔

شبانہ نے پھر دعویٰ کیا کہ نہیں میرا ''پرویز'' ایسا نہیں ہے وہ مجھ سے سچی محبت کرتا ہے وہ تو ''کورٹ میرج'' کیلئے مجھے لے کر گیا تھا لیکن ایک وکیل صاحب نے دارالامان کا مشورہ دے دیا، میں تو نادان ہوں کبھی گھر سے باہر نہیں نکلی لیکن پرویز بچہ تو نہیں، سب کچھ جانتا ہے وہ کل ''کورٹ میرج'' کے کاغذات مکمل کر کے عدالتی حکم پر مجھے لے جائے گا

زبیدہ نے ایک طنزیہ سا قہقہہ لگایا اور بولی یہاں کل کبھی نہیں آتا، میں بھی کل تمہیں کسی اور انداز میں ملوں گی یہ میری میٹھی زبان صرف آج تک کیلئے ہے۔ اپنی ''رومیٹ'' مہناز سے پوچھ لینا ''مجھے لڑکیاں جلاد کہتی ہیں''

جوں ہی زبیدہ کمرے سے باہر گئی شبانہ نے پھر سے رونا شروع کر دیا اور وقفے وقفے سے مہناز سے سوالات بھی کیے، مہناز یہ اپنے آپ کو ''جلاد'' کیوں کہہ رہی تھی؟

مہناز نے اودھر اُدھر دیکھتے ہوئے جواب دیا ''اس لئے کہ بہت ظالم اور بدتمیز ہے'' جب یہ کسی لڑکی سے ناراض ہو جائے تو اس طرح ڈنڈا چلاتی ہے کہ مرد بھی شرما جائیں، پھر بھی کوئی قابو نہ آئے تو ''پپو لوفر، شمو جٹی اور آشا پاگل'' کو بلوا لیتی ہے ہم جیسی لڑکیوں کیلئے تو ''پپو لوفر'' ہی کافی ہے ''غنڈی ہے غنڈی'' سات آٹھ مرتبہ گھر سے مختلف مردوں کے ساتھ بھاگی ہے کئی کئی مہینے غیر مردوں کے ساتھ محبت کی پینگیں چڑھائی لیکن اَب پانچ سال سے یہاں چودھراہٹ کر رہی ہے ہر نئی لڑکی کی آمد پر ''آفس'' میں انٹری کے بعد پہلی تفتیشی رپورٹ وہی بناتی ہے ''میڈم زبیدہ'' کی چمچہ خاص۔۔ تم سے بھی ملاقات ضرور ہوئی ہوگی؟

شبانہ فوراً بولی وہ تو نہیں جس کے بال لڑکوں جیسے کٹے ہیں اور شلوار قمیض بھی مردانہ پہنتی ہے۔

مہناز نے کہا ہاں ہاں وہی، پان بھی بکری کی طرح چباتی ہے لیکن لڑکیوں کی اس نگری میں وہ بکری نہیں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر بھیڑیا بن چکی ہے کسی خودسر لڑکی کی شکایت ملے تو میڈم زبیدہ پہلا ''علاج'' اس سے ہی کرواتی ہیں اگر بات بڑھ جائے تو ''شمو جٹی'' سرخ سفید ساڑھے پانچ فٹی سے مدد حاصل کی جاتی ہے اور اگر کوئی اس کے قابو بھی نہ آئے تو پھر آخری عدالت آشا پاگل لگاتی ہے۔ میرے ساتھ تو ''پپو لوفر'' نے ہی ایسا یادگار سلوک کیا تھا کہ میں سب کچھ بھول گئی کہ میں کیا تھی؟ اَب مجھے صرف یہ یاد ہے کہ میں ''دلدار'' کے عشق میں پھنس کر دارالامان کی چار دیواری میں پھنس چکی ہوں کبھی روٹی نہیں پکائی تھی نہ کبھی ہانڈی کا

نمک مرچ چکھا تھا اب میں صرف چھ ماہ میں سب کچھ کر لیتی ہوں "ممو جی اور آشا پاگل" کے خوف سے اس لئے کہ ان کی اذیت ناک داستانیں سن سن کر میں کانپ جاتی ہوں دونوں "ریکارڈ یافتہ" ہیں ان کے گھر والے بھی دونوں سے لاتعلق ہیں اور یہ برسوں سے "دارالامان" میں عیش کر رہی ہیں ان کا طوطی بولتا ہے ان کے سامنے میڈم بھی کسی کی نہیں سنتی۔ اچھا یہ تو بتا "چھو لوفر" سے پہلی ملاقات کیسی رہی؟

سہمی ہوئی شبانہ نے کہا' بہت بری۔ وہ کچھ ہوا جو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا لیکن برداشت اس لئے کر گئی کہ شاید یہاں ایسا ہی ہوتا ہے پھر بھی کیا ہوا؟ مہناز نے پوچھا؟؟

شبانہ بولی' مجھے ایک رکشے والا یہاں گیٹ کے قریب چھوڑ کر گیا، پرویز نے سو روپے دیئے تھے وہ میں نے کرایہ دے دیا "آفس" میں آئی تو میڈم زبیدہ سے پہلے ایک خاتون نے پوچھا "یہاں کیوں آئی ہو؟" میں نے فرضی کہانی سنا دی جو پرویز نے مجھے یاد کرائی تھی۔ بولی' شکل صورت اور لباس سے تو کسی اچھے گھرانے کی لگتی ہو؟ میں نے جواب دیا "ہاں"

خاتون نے کہا' پھر یہاں کیوں آئی ہو؟

میں نے جواب دیا' میری ماں نے دوسری شادی کر لی ہے اور میرا "سوتیلا باپ" میری ماں سے زیادہ مجھ میں دلچسپی رکھتا ہے جب اس اندیشے کا ذکر میں نے اپنے کزن پرویز سے کیا تو وہ "سیخ پا" ہو گیا تقریباً آٹھ ماہ ہم دونوں چھپ چھپ کر منصوبہ بندی کرتے رہے پرویز بھی صاحب حیثیت ہی نہیں ، ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ڈاکٹر ہے زیادہ سے زیادہ سات سال مجھ سے بڑا ہو گا بظاہر وہ مجھے مصیبت سے نجات دلانے کیلئے چھپ چھپ کر ملنے آتا تھا لیکن جب تنہائی میں بار بار ملے تو کئی مرتبہ اس نے جوش جذبات میں مجھے سینے سے لگا لیا تب مجھے اپنے دل کی رفتار بدلتی محسوس ہوئی اور پھر چند ملاقاتوں کے بعد دونوں دل اکٹھا دھڑکتے محسوس ہونے لگے اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کو زندگی بھر کیلئے "پارٹنر" بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ یوں بات اتنی بڑھی کہ ہم ایک دوسرے کا گھنٹوں انتظار کرتے، فون پر رابطہ نہ ہوتا تو نہ بھوک لگتی اور نہ ہی نیند آتی ہم نے "ماں باپ" سے دبے لفظوں میں ذکر کیا لیکن کسی کو اندازہ نہ ہوا کہ دو دل کیا چاہتے ہیں--- مایوسی نے آن گھیرا، پرویز ہر لمحے اپنی بے چینی اور محبت کی یقین دہانی کراتا، میں بھی جلد از جلد اس انجانی محبت کا انجام چاہتی تھی۔

"ایک روز کالے گھنے بادل خوب گرجے اور برسے بھی، بجلی چلی گئی اور گھپ اندھیرے میں بیٹھی پرویز کا انتظار کر رہی تھی ، ہر لمحہ گھنٹوں جیسا طویل محسوس ہو رہا تھا کبھی اپنے آپ کو کوستی کبھی پرویز کو، اتنے میں

پرویز بھی بارش میں بھیگا ہوا آ کر مجھ سے ایسے ٹکرایا کہ جیسے بجلی گری ہو، پھر مت پوچھو کیا ہوا ؟ وہ سب کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ بعد میں احساس ہوا ''جوانی'' کس قدر دیوانی ہوتی ہے۔''

چند دنوں تک چھپن چھپائی ملاقاتوں کا سلسلہ چلتا رہا لیکن ہمیں احساس ہوا کہ ہم دونوں اَب پہلے سے نہیں رہے بلکہ کچھ زیادہ بے باک ہو گئے ہیں ایک روز میں نے پرویز سے مطالبہ کیا کہ اَب اس ''پریم کہانی'' کو منزل تک پہنچانے کی فکر کرو، تم اچھے مرد ہو کہ اپنے ''پیار'' کو حاصل کرنے کی بجائے معاشرتی رکاوٹوں کے سامنے مصلحت کا شکار ہو گئے ہو؟ بھلا یہ کیا مردانگی ہوئی ؟ اَب اس موضوع پر ہم دونوں کے درمیان ''بحث و مباحثہ'' اس قدر ہوا کہ بات ''تکرار'' تک پہنچ گئی آخر کار پرویز نے خاندانی روایات سے بغاوت کر کے ''کورٹ میرج'' کا فیصلہ کر لیا، میں نے بھی نتائج سے بے خبر ہوتے ہوئے بھی فوراً ہاں کر دی اس لیئے کہ ''برسات کی رات'' کے خیال سے ہی بدن میں جھرجھری آ جایا کرتی تھی یہی دعوتی پرویز کا تھا اور پھر میں دو کپڑوں میں چند روز پہلے گھر سے نکل آئی، مجھے نہیں علم کہ میرے اس فیصلے کے بعد ''ماں باپ'' کا کیا ردعمل ہے، میں صرف یہ جانتی ہوں مجھے پرویز نے ایک خوبصورت ہوٹل میں رکھا اور یہ تمام راتیں سہانی تھیں، میں سارا سارا دن سوتی اور آرام کرتی ،اچھا کھانا ،ریڈی میٹ مہنگے سوٹ کا انتظام پرویز نے کر رکھا تھا اس لئے پتہ ہی نہیں چلا کہ یہ دن کیسے گزر گئے؟ اس دوران میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ ''نکاح'' کا مطالبہ کیا اور پرویز نے مجھے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا ''کورٹ میرج'' کے کاغذات تیار کرا رہا ہوں ایک روز میں نے اپنے مطالبے میں ذرا سختی کی تو جھنجھلا کر بولا ''کورٹ میرج'' اتنی آسان نہیں جتنی میں سمجھ رہا تھا، وکیل صاحب کہہ رہے ہیں کہ تمہارے والدین نے مجھ پر شک کرتے ہوئے اغواء کا پرچہ کٹوا دیا ہے

میں نے پوچھا ''پھر اَب کیا ہو گا؟''

کہنے لگا وکیل صاحب کا مشورہ ہے کہ میں تمہیں ''دارالامان'' میں کسی طرح داخل کرا دوں پھر ہم عدالتی حکم پر تمہیں وہاں سے نکال کر ''کورٹ میرج'' کر لیں ،ایسی صورت میں تم ''دارالامان'' میں داخلے کیلئے والدین کے ظلم و ستم کی فرضی کہانی سناؤں گی تا کہ یہ بات ثابت ہو جائے کہ تم وہاں اپنی مرضی سے گئی ہو لیکن میرا دل ایک لمحے کیلئے تمہیں اپنے سے دور نہیں کرنا چاہتا، پہلے میں گھبرائی پھر میں نے مجبوراً وکیل صاحب کے مشورے پر سوتیلے والد کی کہانی سنا کر ''دارالامان'' میں داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا ، پرویز مجھے باہر چوک تک چھوڑنے بھی آیا پھر راستہ بتا کر رکشے میں بٹھا دیا اور میں

یہاں پہنچ گئی

مہناز نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے کہا لیکن میں نے تو "پیو لوفر" کی تفتیش کے بارے میں پوچھا تھا

شبانہ نے شرمندگی سے کہا میں بھی کتنی بے وقوف ہوں، مفت میں اپنی سٹوری سنا دی تھوڑی سی خاموشی کے بعد کہنے لگی میرے ہاتھوں میں چار سونے کی چوڑیاں، ہاتھ میں ایک گھڑی اور کانوں میں بالیاں تھیں جو میں نے آفس میں خاتون کے حوالے کر دیں تھیں اور خاتون نے ان کا اندراج کر کے مجھ سے دستخط بھی کرا لیے تھے لیکن جونہی میں اندر جانے کیلئے آفس سے نکلی سامنے ایک خاتون تمہارے بتائے ہوئے حلیے کی کھڑی تھی، اس نے مجھے بڑے طنزیہ انداز میں کہا "تو یہاں آئے ہو سوہنیو" میں نے سر ہلا دیا میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایک کمرے میں لے گئی اور سوال جواب شروع کر دیے۔

کہاں سے آئی ہو؟ کیوں آئی ہو؟ عشق کی روگی ہو یا ظلم وستم کی ستائی ہوئی؟ گھر سے کیا کچھ لے کر بھاگی ہو؟ نقد رقم کتنی ہے تمہارے پاس؟ یہاں کون چھوڑ کر گیا ہے؟ راستہ کیسے پتہ تھا تمہیں؟

میں ایک بار پھر گھبرا گئی لیکن اس کی شاطر نظریں کہہ رہی تھیں کہ بتاتی ہو یا کوئی اور کارروائی کی جائے؟ میں نے اسی میں بہتری سمجھی کہ سب کچھ بتا دیا جائے اور پھر بتا دیا، میری من گھڑت داستان سنتے ہوئے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ بتا رہے تھے کہ جیسے وہ مطمئن ہے لیکن "نقد رقم" کے معاملے پر اس نے اپنا رویہ بالکل تبدیل کر لیا میں نے ہر ممکن یقین دہانی کی کوشش کی پھر بھی وہ نہیں مانی، کہنے لگی یہاں آنے والی ہر لڑکی یہی کہتی ہے کہ اس کے پاس نقد کچھ بھی نہیں لیکن دوسرے روز ہی رقم چوری کی شکایت لے کر دفتر آ جاتی ہے، اس نے غصے سے کہا سچ سچ بتاؤ نہیں تو میں اپنا "فارمولا" استعمال کروں گی، میں ٹس سے مس نہیں ہوئی تو مجھے کھڑا کر کے تلاشی لینی شروع کر دی اس نے میرا پورا جسم ٹٹولا پھر بھی اندیشہ ظاہر کیا کہ میں نے رقم کہیں چھپائی ہوئی ہے پھر یکدم اس کے تیور بدلے اور اس نے کپڑے اتار کر جامعہ تلاشی کا حکم صادر کیا، میرے لئے یہ انتہائی مشکل مرحلہ تھا لیکن اس نے آگے بڑھ کر میری معاونت کی اور چند لمحوں میں ہی اس نے تسلیم کر لیا کہ میں سچ بول رہی ہوں۔

مہناز بولی شکر ہے وہ مطمئن ہو گئی میں نے ہچکچاہٹ میں منفی رویہ ظاہر کیا تھا تو اس نے دائیں ہاتھ کا ایسا تھپڑ رسید کیا تھا کہ کئی ہفتے کان بند رہا تھا

شبانہ بولی میرے لئے تو "جامعہ تلاشی" کا مرحلہ ہی کافی ہے دیکھو اب بھی میں کانپ گئی ہوں، مجھے یہ بتاؤ میرا گزارا کس طرح ہوگا یہاں؟

مہناز نے کہا جس طرح میں کر رہی ہوں، ہاں میں ہاں ملا کر، جو کام کہا جائے فوراً حامی بھر لو، انکار کی غلطی نہ کرنا ورنہ قیامت آجائے گی

شبانہ نے پریشانی کے عالم میں جواب دیا میں کونسا یہاں ہمیشہ رہنے کیلئے آئی ہوں

مہناز بولی، تم کیا سمجھتی ہو، یہاں جتنی لڑکیاں ہیں وہ رہنے کیلئے آئی ہیں؟ سب کی کہانیاں تقریباً ایک سی ہیں

میری سنو

شبانہ ہاں سناؤں؟

میں فیصل آباد کے ایک انتہائی مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں، مجھے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی بلکہ دروازے پر کھڑے ہونے پر بھی جھاڑ پڑتی تھی پھر بھی میں ''دلدار مسیح'' کی بلوری آنکھوں کی اسیر ہوگئی، میں اپنی سہیلیوں کی مدد سے کئی مرتبہ اسے تنہائی میں ملی اور یہ سلسلہ اس قدر آگے بڑھا کہ آج میں ''دارالامان'' میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئی مجھے ''دلدار'' نے مذہبی اختلاف کے باعث ہم دونوں کی شادی نہ ہونے پر قائل کیا لیکن میری ضد پر حل یہی نکلا کہ گھر سے بھاگ کر اپنی من مرضی کا سودا کر لیں، مجھے ''دلدار'' نے بھی ایک رکشے میں سوار کر کے ''اخبار'' کے دفتر بھیجا جہاں میں نے بھی ایک ''رٹی رٹائی'' داستان سنا کر دارالامان کا راستہ اپنایا، دلدار کا دعویٰ تھا کہ وہ ایک دو روز میں ''کورٹ میرج'' کے کاغذات تیار کر کے لے جائے گا، مجھے ایک نوجوان صحافی یہاں پہنچانے آیا تھا میں نے اس سے بھی وعدہ لیا تھا کہ اگر ''دلدار'' نے دھوکہ دیا تو وہ مجھے حوصلہ دینے کیلئے ملنے ضرور آئے گا لیکن چھ ماہ گزرنے کے باوجود کوئی نہیں آیا۔ میں تنہائی میں ''دلدار'' کی بے وفائی پر آنسو بہاتی ہوں لیکن کسی کو نہیں بتاتی اس لئے کہ لوگ مذاق اڑاتے ہیں

شبانہ نے مہناز کی بات کاٹتے ہوئے کہا' نہیں تم دیکھنا ''پرویز'' ضرور آئے گا

مہناز نہیں، اب کوئی نہیں آئے گا اس لئے کہ عزیز و اقارب اور والدین جگ ہنسائی کے ڈر میں منہ پھیر لیتے ہیں اور ''دلدار'' جیسے حالات کی رو میں بہہ کر کہیں اور دلداری میں وقت گزار لیتے ہیں

شبانہ میں نہیں مانتی، پانچوں انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں ہم نے کئی دن رات اکٹھے گزارے ہیں ایک دوسرے کے ساتھ مرنے جینے کا وعدہ کیا ہے تم دیکھنا کل نہیں تو پرسوں پرویز اپنے وکیل کے ساتھ آئے گا اور میں تمہیں منہ چڑاتی یہاں سے چڑیا کی طرح پھر سے اڑ جاؤں گی

مہناز۔ میں تو یہ جانتی ہوں اس ادارے میں موجود درجنوں لڑکیاں ایسے ہی خواب دیکھتی یہاں تک پہنچتی ہیں بس یہاں سے واپسی ان کی ہوئی ہے جن کے والدین نے اپنے خون کی حفاظت کیلئے بے شرمی کو گلے لگا لیا ورنہ ہر عمر کی لڑکی موجود ہے کسی کی بھی کہانی

خود سن لینا، مرکزی خیال سب کا ایک ہی ہو گا ''لو میرج'' بس تصویر کے رنگ مختلف ہونگے کیونکہ آرٹسٹ بھی تو مختلف ہیں۔

میری ایک بات پلے باندھ لو' اللہ کرے ''پرویز'' آ جائے تم نے تو چند روز اس کے ساتھ شب و روز گزارے ہیں مجھے تو میرا ''دلدار'' بلی کی طرح کبھی کہیں کبھی کہیں چھپا تا رہا لیکن پھر بھنورے کی طرح پھول کی ساری خوشبو چوس کے اڑ گیا اَب میں اپنی ذات، سوچ اور قسمت کو ہر وقت کوستی رہتی ہوں حالانکہ سب کچھ میرا اپنا کیا دھرا ہے، تم بس جتنے دن یہاں رہو اپنے آپے سے باہر نہ ہونا، نہیں تو ''پنو لوفر، نمو جٹی اور آشا پاگل'' تمہارا ایسا علاج کریں گی کہ زندگی بھول کر ''موت'' سے پیار کرنے لگو گی۔

شبانہ کہنے لگی' اَب تو میری زندگی کی منزل ''پرویز'' ہے میں اس کے بغیر ادھوری ہوں اگر اس نے بے وفائی کی تو میں زندگی کا خاتمہ کر لوں گی

مہناز بولی ''زندگی'' قدرت کا تحفہ ہے جذباتی ہو کر کوئی غلط فیصلہ نہ کر لینا، حالات سے سمجھوتہ کرو، غلطی کی ہے تو خمیازہ بھی بھگتو۔ اگر تم نے کوئی کارنامہ کیا تو تمہارے ساتھ میری شامت آ جائے گی کیونکہ میں تمہاری ''رومیٹ'' جو ہوں

شبانہ تم فکر مت کرو۔ میں بھولی ہوں پر اتنی بھی نہیں کہ تمہیں پھنسا دوں لیکن ایک بات بتا دوں، میں ہانڈی روٹی اپنی نہیں کر سکتی تو سو پچاس کی کیسے کروں گی؟ مجھے لگتا ہے کہ نمو جٹی اور آشا پاگل سے میرا ٹاکرا ضرور ہو گا

ہنس کر مہناز بولی' تم کیوں منحوس باتیں کر رہی ہو؟ چلو کھانا کھائیں اور سو جائیں، صبح کی صبح دیکھی جائے گی

شبانہ نے انتہائی مایوسی کے عالم میں کہا' میری ''بھوک اور نیند'' دونوں اڑ گئیں ہیں تم جاؤ

مہناز نے جواب دیا ''نہیں میں اکیلی نہیں جاؤں گی'' آفس سے تمہارا نام بھی وہاں چلا گیا ہو گا اگر تم نہ گئیں تو مجھ سے پوچھ گچھ ہو گی اس لئے کہ یہاں کھانا نہ کھانے والے کو ''بھوک ہڑتالی'' شمار کیا جاتا ہے یعنی ادارے کے قانون سے بغاوت، چلو چاہے ایک آدھ لقمہ ہی لے لو لیکن انکار نہ کرو، نہ چاہتے ہوئے بھی شبانہ اٹھ کھڑی ہوئی جونہی ''میس'' میں داخل ہوئی تمام لڑکیوں نے بھرپور تالیوں سے اس کا استقبال کیا، معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک دو نے سیٹیاں بھی بجائیں، مختلف آوازیں بھی کسی گئیں لیکن مہناز نے اسے اشاروں ہی اشاروں میں خاموش رہنے کی تاکید کر دی

ایک نے آواز لگائی، ''نواں پروہنا'' کجھ بولے گا نہیں؟

دوسری نے کہا' کوئی نہیں اَج نہیں تے کل بولے گا

تیسری بولی' محترمہ کا نام نامی شبانہ اعظمی ہے نخرہ تو کریں گی (زوردار قہقہہ بلند ہوا)

چوتھی نے پوچھا "کم از کم نئی گھوڑی "ونڈ" تے وکھائے

جب شبانہ نے سب کچھ برداشت کر لیا تو ایک گروپ اٹھ کر قریب آیا اور شرارتی انداز میں یک زبان بولا "حضور آداب" ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں مبارک ہو، اب آپ بھی ہماری طرح اس عمارت نما پنجرے میں پھڑ پھڑا سکتی ہیں "اڑ" نہیں پائیں گی ہماری بھی باہر بڑی "اکڑ پھوں" تھی اب کوئی پوچھتا بھی نہیں (سب قہقہہ لگاتی ہیں)

میں "قیدی" نہیں، ایک ادارے کی حفاظت میں آئی ہوں، شبانہ نے جواب دیا (سب لڑکیاں پھر ہنستی ہیں)

لڑکیاں بولیں "اچھا ہمیں نہیں پتہ تھا شکریہ شکریہ معلومات فراہم کرنے کا" (پھر سب قہقہہ لگاتی ہیں)

ایک لڑکی آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ کی مٹھی کو مائیک بنا کر — بریکنگ نیوز -- ناظرین تازہ ترین خبر یہ ہے کہ ایک خوبرو نوعمر لڑکی شبانہ اپنی محبت کو حاصل کرنے کیلئے گھر کی دیوار پھلانگ کر "دارالامان" پہنچ گئی جہاں مقیم لڑکیوں نے اس کا زبردست استقبال کرتے ہوئے نوید دی ہے کہ اب تم بھی ہماری طرح "محبت" بھول کر ہنسی خوشی ہمارے ساتھ زندگی گزارو -- تالیاں

لڑکیاں تالیاں بجاتی ہیں اور شبانہ دل ہی دل میں کڑھتی ہے اس سے قبل کہ وہ کچھ بولے" مہناز نے اشارے سے ردعمل پر منع کر دیا اور کھانے کی پلیٹ آگے بڑھاتے ہوئے روٹی تھما دی، روٹی پکڑتے ہوئے شبانہ نے دھیمی آواز میں کہا "دل نہیں چاہ رہا"

مہناز نے زور دیا "چند لقمے کھا لو"

آواز آئی، مہناز نیا "پروہنا" ہے چند دن تو نخرے کرے گا اسے نہیں پتہ یہاں "نخرہ وخرہ" نہیں چلتا (سب ہنستی ہیں)

مہناز نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا لیکن شبانہ نے پھر بھی توجہ نہ دی، ایک آدھ لقمے کے بعد چھوڑ دیا، اس کے "من مندر" میں مختلف کہانیاں جنم لے رہی تھیں لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ نے بھی اس کے منتشر ذہن پر خاصا "بوجھ" ڈالا، مہناز نے اسے کمرے میں جاتے ہی حالات سے سمجھوتہ کرنے کیلئے ایک تفصیلی لیکچر دیا اور آگاہ کیا کہ "صبح" آج سے بھی مختلف ہوگی یہاں صرف "جی حضوری" کر کے جان چھڑائی جا سکتی ہے یہاں جو کوئی "کام کاج" میں مددگار بن جائے اس کی عزت میں اضافہ اور انکار پر زیر عتاب آ جاتا ہے

شبانہ بولی "مجھے تو ہانڈی روٹی سے کوئی دلچسپی نہیں، صفائی ستھرائی بھی کبھی نہیں کی اب کیا ہوگا؟

مہناز نے کہا "محبت امتحان لیتی ہے گھبرائی گی تو گھر سے تو نکلی ہے یہاں بھی ماری جائے گی، جیسے تیسے وقت گزار- اللہ کرے

تیری محبت رنگ لے آئے اپنی "محبت" تو جعلی نکل گئی۔

اس فقرے پر شبانہ چونک کر بولی' یہ مجھے حوصلہ دے رہی ہو؟ یا دعا؟

مہناز نے مسکراتے ہوئے کہا' جو تمہیں سمجھ آئے---ویسے یہاں اکثریت واپس کبھی نہیں لوٹی، جیسے لاوارث اور یتیموں کو یتیم خانے پہنچا کر لوگ بھول جاتے ہیں، اچھا چھوڑ ان باتوں کو چپ کر کے سو جا۔ میں تو سونے لگی ہوں صبح ناشتے پر میری باری ہے

شبانہ واہ کتنے آرام سے کہہ دیا سو جا، مجھے نیند کہاں آئے گی؟

مہناز بولی 'کوشش کر اب یہی تیرا "آشیانہ" ہے تو نے جو کرنا تھا کر لیا، اب حالات تجھے بہت کچھ سکھائیں گے "سکھ چین" جو اپنے گھروں میں ہوتا ہے وہ گھر سے نکل کر کبھی نہیں ملتا، میں کیا میری اوقات کیا، یہاں تو بڑے بڑے گھرانوں کی لڑکیاں اپنے کیے کی بھگت رہی ہیں۔ سمجھوتہ کر،، خوشی خوشی حالات کا مقابلہ کر ورنہ یہ حالات تجھے کہیں کا نہیں چھوڑیں گے، یہ سوچ کہ تیری اس "محبت" پر والدین، بہن بھائی کس مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔ اچھا "شب بخیر" اور منہ رضائی کے اندر کر لیتی ہے۔

شبانہ کی آنکھوں میں نیند تو تھی نہیں، پھٹی پھٹی آنکھوں سے کمرے کا جائزہ لیتی رہی، خاصی دیر گزرنے کے بعد بیڈ سے اٹھ کر دروازے کی کنڈی لگائی تو مہناز چونک کر اٹھ بیٹھی

یہ کیا کر رہی ہو تم؟ مہناز نے پوچھا' یہاں کنڈی نہیں لگاتے رات کے کسی پہر بھی میڈم زبیدہ راؤنڈ پر آ کر چیک کر سکتی ہیں کہ تم کس حال میں ہو؟ ہو بھی کہ نہیں؟

شبانہ نے کہا' وہ کیوں؟

مہناز نے جواب دیا' ذمہ داری ہے ان کی، تم "نواں پروہنا" جو ہو---

میں "نواں پروہنا" شبانہ خود کلامی میں بولنے لگی۔ واہ بھئی کل "میس" میں لڑکیاں کہہ رہی تھیں "تویں گھوڑی وند دکھاوے"

(مایوسی کے عالم میں) اے خدا۔ محبت کرنا اتنا بڑا جرم ہے (اپنے آپ سے) پتہ نہیں میری جان چھٹے گی بھی کہ نہیں۔ نیند کوسوں دور تھی لیکن کبھی اونگھتی کبھی جاگتی، خیالوں میں گم بطرح طرح کے وسوسے اور اندیشوں نے ایسا گھیرا کہ خوف اور ان دیکھے ڈر کے سواء اس کے پاس کچھ نہ تھا، سوچ رہی تھی کہ کیا سچ مچ "پرویز" بے وفا ہے؟ وہ نہیں آئے گا یہ لوگ تو یہی کہہ رہے ہیں لیکن میرا دل ہے کہ مانتا نہیں؟؟؟ شبانہ نے ساری رات گزار دی، اذان کی آواز بلند ہوتے ہی مہناز اٹھ کھڑی ہوئی جونہی کمرے کی لائٹ جلائی تو نظر پریشان حال شبانہ پر پڑی

مہناز نے پوچھا' ابھی تک جاگ رہی ہو؟

شبانہ۔ اور کیا کروں؟

مہناز بولی' چھ ماہ میں حالات نے مجھے یہ سمجھا دیا ہے کہ ''ہتھی لایاں، دنداں نال کھولنیاں پئیندیاں نیں'' کا مطلب کیا ہے انسان معمولی سی غلطی بھی اپنی پوری سوچ سمجھ کے ساتھ کرتا ہے اور پھر ساری عمر پچھتاتا ہے اور کوستا مقدر کو ہے؟ تمہارا بھی اَب کوئی حال نہیں، میری طرح غلطی تسلیم کرو اور دعا مانگو کہ ہمارے اندازے غلط ثابت ہوں اور ایک نہ ایک دن ''پرویز'' تمہیں لینے آ جائے لیکن اس حقیقت کو بھی تسلیم کرو کہ یہاں تمہاری مرضی نہیں چلے گی حالات سے سمجھوتہ کرو، ناشتے کے بعد شائد تمہاری بھی کوئی ''ڈیوٹی'' لگ جائے۔

شبانہ نے حیرانگی سے پوچھا ''ڈیوٹی''

مہناز نے جواب دیا- ہاں روٹی پکانی، آٹا گوندھنا، صفائی ستھرائی، برتن دھونا وغیرہ وغیرہ

شبانہ نے پریشانی کے عالم میں کہا 'لیکن مجھے تو کچھ نہیں آتا؟؟؟

تم مت گھبراؤ - میں تمہارا ساتھ دوں گی، انکار مت کرنا، ورنہ نیا پھواڑہ پڑ جائے گا مہناز نے تسلی دی اور چلی گئی

شبانہ تنہائی میں ایک مرتبہ پھر خیالوں میں گم ہو گئی، خاصی دیر ''گم سم'' بیٹھی رہی پھر اچانک اپنے آپ سے گفتگو کرنے لگی ''واہ شبانہ''

کیسا لگایا تو نے محبت کا نشانہ، نہ گھر رہا نہ گھرانہ، منہ کالا کر لیا (یک دم ایک آواز فضاء میں گونجی جیسے اس کی ہم ذات ہمکلام ہو)

''ہاں کیا ملا اندھی محبت میں؟ مرتی تھی پرویز کیلئے، اَب سمجھ تو مر ہی گئی!!!! اس چار دیواری میں سب کی سب محبت کی نشانیاں گھوم رہی ہیں کسی کے چہرے پر رونق نہیں، کوئی امیر زادی ہے تو کوئی غریب لیکن ''محبت'' نے انہیں خون تھکوا دیا، اَب روتی ہیں اپنے فیصلے پر، مگر کوئی ان کی نہیں سنتا، اس لئے کہ پہلے ان سب نے کسی کی بات نہیں سنی- کبھی سوچا؟ رانجھے کو ہیر ملی تھی؟ لیلیٰ مجنوں خوار نہیں ہوئے؟ یا سسی پنوں کو مل گئی تھی؟ واہ نئی کہانی بنانے نکلی تھی اور خود کہانی بن گئی؟''

زوردار قہقہے --- فضاء میں گونج گئے

نہیں،، میں نے سب کچھ غلط کیا اور شائد ایک غلطی اور بھی کروں- شبانہ گھبراہٹ میں بولی ''خودکشی'' آواز آئی بس اگر اتنی ہی ہمت تھی تو پھر گھر سے کیوں بھاگی تھی؟

شبانہ نے فوراً جواب دیا' میں بھاگی نہیں تھی اپنی محبت کی تلاش میں نکلی اور راہ میں بھٹک گئی، اب نہیں جانتی میرا مستقبل کیا ہو گا (پھر اپنے آپ سے) مجھے تو ''کام کاج'' کی بھی عادت نہیں، ابھی تو اس امتحان سے بھی گزرنا ہے اور پھر ''گم سم'' ہو کر بیٹھ گئی اور خلاؤں میں گھورنے لگی

اچانک ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی اور بولی' تمہارا نام ''شبانہ'' ہے

ہاں- کیا بات ہے؟
لڑکی بولی' مہناز کہہ رہی ہے ناشتہ کرلو وقت ختم ہوگیا تو کچھ نہیں ملے گا
شبانہ نے جواب دیا' تم جاؤ میں آتی ہوں، کچھ دیر سوچوں میں گم رہی پھر چائے پینے کی غرض سے ''میس'' کی طرف چل دی- اسے ایسا محسوس ہوا کہ لڑکیاں اسے گھور گھور کر دیکھ رہی ہیں اس کا ایک قدم چلنا محال ہوگیا لیکن اس نے مہناز کی باتیں یاد رکھتے ہوئے کسی بات پر دھیان نہیں دیا صرف ''چائے'' پی اور واپس آگئی-
شبانہ مایوسی کے عالم میں بیٹھی تھی پہلے اس نے سوچا کیوں نا ''میڈم زبیدہ'' کو اپنے گھر کا حقیقی پتہ بتا کر گھر والوں سے رابطہ کرے پھر خیال آیا کہ اب تو گھر کی آگ طوفان بن گئی ہوگی جلتی پر تیل نہ ڈالوں اور حالات کا مقابلہ کروں
اسی لمحے مہناز آگئی اور ذرا غصے میں مخاطب ہوئی' شبانہ بیگم تمہاری کھوپڑی میں میری بات نہیں آئی، یہاں روٹی، پراٹھے ہر چیز گنتی کے حساب سے بنتی ہے شکر ہے کہ تین چار پراٹھے بچے ہوئے تھے ورنہ اکیلی تم پراٹھا چھوڑتیں تو عذاب آجانا تھا - آپا- ناراض ہورہی تھی یقیناً اس نے میڈم زبیدہ کو بھی بتایا ہوگا اگر انکوائری ہوگئی تو مت پوچھ کیا ہوگا؟
یہ ''آپا'' کون ہے؟ شبانہ نے پوچھا
مہناز بولی' یہی ہے آشا پاگل، سب اس کے خوف سے ''آپا'' کہتے ہیں اس کی سزا بڑے بڑے برداشت نہیں کر پاتے تم تو اس کی جھڑکی پر ہی پیشاب خطا کرلوگی- میں تیری دشمن نہیں، تیرے بھلے کیلئے اپنے تجربے سے سمجھاتی ہوں اگر کسی کو معلوم ہو گیا کہ میں تیری ''استانی'' بنی ہوئی ہوں تو میری پیشی بھی ڈائریکٹ ہیڈ استانی کے پاس ہوگی
شبانہ نے دریافت کیا وہ کون ہے؟
مہناز نے جواب دیا ''نموجٹی'' --وہ بکواس بھی کرتی ہے اور ظلم بھی
بھلا میرا کیا واسطہ ''نموجٹی'' سے، شبانہ بولی
مہناز نے کہا' جب تم ''بھوک ہڑتال'' کروں گی تو انتظامیہ اس کا نوٹس تو لے گی اور معاملہ خود بخود ''نموجٹی'' تک پہنچ جائے گا- لیکن میں نے تو ''بھوک ہڑتال'' نہیں کی، خود جا کر چائے پی، بس ''پراٹھا'' نہیں کھایا- دل نہیں کر رہا تھا، شبانہ نے جواب دیا-
مہناز بولی' اب تمہیں گھر سے نکلے تقریباً ایک ہفتہ بیت چکا اور یہاں بھی دوسرا روز ہے اس چار دیواری میں ''گنتی'' کی بڑی اہمیت ہے اگر اپنے لئے آسانیاں چاہتی ہو تو کیا، کیوں، کیسے؟ جیسے سوالات سے پرہیز کرو کیونکہ یہی ''علاج'' سے بہتر ہے جو بات سمجھ نہ آئے میں حاضر ہوں لیکن میری اس مخلصانہ کوشش کو عام نہ کرنا ورنہ میں بھی سرعام بے عزت ہو جاؤں گی اور

تمہاری بھی خیر نہیں رہے گی
شبانہ نے جھنجھلا کر کہا اس بار بار مرنے سے بہتر ہے کہ ایک مرتبہ ہی مر جاؤں مہناز۔ میں نے جو غلطی کی اس پر شرمندہ ہوں اور اَب سوچتی ہوں کہ لڑکیاں تو اسی روز مر جاتی ہیں جس روز "خودسر" ہو کر کسی اندھی محبت میں گھر کی دہلیز سے قدم باہر رکھتی ہیں تم مرو یا جیو۔۔ گھر والوں کیلئے تو مر ہی چکی ہو۔۔ میری ماتو اور یہاں برداشت اور پیار سے اپنے کئے کی سزا بھگتو، رو دھو کر بھی زندگی گزارنی پڑے گی اس لئے حالات سے سمجھوتہ ضروری ہے

شبانہ نے مثبت انداز میں سر ہلاتے ہوئے ٹھیک ہے کہہ ہی دیا، حالانکہ اس کے من میں چور تھا کہ بھلا وہ کیسے ہر بات پر ہاں کر سکتی ہے گھر میں تو اس نے کبھی اپنے ہاتھوں پانی نکال کر نہیں پیا

مہناز یہ سب کچھ سمجھ چکی تھی اس لئے ایک اچھے "رومیٹ" کی طرح اپنے تجربات کی روشنی میں نہ صرف "شبانہ" کی تربیت کرتی رہی بلکہ صفائی، ستھرائی، باورچی خانہ اور دوسری ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹانے کے بہانے سارا کام خود ہی کر دیتی لیکن تین چار روز میں یہ راز "فاش" ہو گیا اور آشا پاگل کے ہاتھوں دونوں قابو آ گئیں "آشا" کا دعویٰ تھا کہ جب سب لڑکیاں ذمہ داری سے اپنا اپنا کام کرتی ہیں تو "مہناز" کس خوشی یا لالچ میں مسلسل "شبانہ" کے ساتھ کاموں میں مصروف پائی جاتی ہے۔

آشا نے پہلا سوال "مہناز" سے کیا مہناز صورت حال بھانپ گئی چالاکی سے بولی میری "رومیٹ" ہے چند دنوں میں ماحول سے واقف اور کاموں کی عادی ہو جائے گی اس لئے میں ہاتھ بٹا دیتی ہوں

آشا نے ایک اعلیٰ نسل کی گالی کے ساتھ کہا "تم نے یہاں "ٹریننگ سنٹر" کھول رکھا ہے پھر ایک قدم آگے بڑھ کر "شبانہ" کو بالوں سے قابو کر کے بولی مجھے "آشا پاگل" کہتے ہیں اپنا کام خود کرو، دنیا اسی کا نام ہے یہاں کوئی کسی کا وزن نہیں اٹھاتا تم کسی بھول میں ہو یہاں لحاظ نہیں ہوتا کسی کا، چاہے کوئی "نواب زادی" ہی کیوں نہ ہو؟ تمہیں کسی نے خط لکھ کر نہیں بلوایا، اپنی مرضی سے آئی ہو، تمہیں سوچنا چاہیے تم نے یہاں قدم رکھا تو اپنے پرائے اور پرائے اپنے ہو چکے ہیں یہی یہاں کی روایات ہیں ورنہ تم پر مر مٹنے والا "دل داجانی" دروازہ پکڑ کر بیٹھا ہوتا۔ آشا نے زوردار جھٹکے سے شبانہ کو چارپائی کی طرف پھینکا اور چلی گئی

چند لمحے مہناز خاموش کھڑے "آشا پاگل" کو جاتے دیکھتی رہی اور پھر شبانہ کے نزدیک جا کر بولی صبر، برداشت، دل چھوٹا نہ کر، یہ تو ٹریلر ہے رونے سے مشکلات کم نہیں اور بڑھ جائیں گی اس نے سہارا دے کر شبانہ کو گلے لگانے کی کوشش کی لیکن وہ مسلسل رو رہی تھی جتنی مرتبہ اسے اٹھاتی وہ

روتے ہوئے کہتی' میرا سر چکرا رہا ہے سر اٹھاتی ہوں تو آنکھوں کے آگے اندھیرا آجاتا ہے کچھ سمجھ نہیں آرہا کیا کروں؟ مہناز نے سہارا دے کر اسے بستر میں لٹا دیا' تھوڑی دیر میں وہ خراٹے بھرنے لگی کیونکہ کئی روز کی جاگی تھی مہناز کا خیال تھا کچھ دیر سو جائے گی تو اس کا ''بلڈ پریشر'' کم ہو جائے گا لیکن جب ساری رات آرام کے بعد صبح سویرے اٹھی تب بھی اس کی حالت بہتر نہیں تھی اسے مسلسل چکر آرہے تھے اس نے صبح ناشتے کے بعد ''میڈم زبیدہ'' کو شبانہ کی طبیعت بارے آگاہ کیا انہوں نے ''سنی اَن سنی'' کرتے ہوئے حکم فرمایا' اسے ڈاکٹر سے دوائی لے کر دے دو، کئی ایسی آئیں اور گئیں ہماری صحت پر ان ذراموں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مہناز حکم بجالائی لیکن کئی روز گزرنے کے باوجود نہ اس کو سر کے درد سے نجات ملی اور نہ ہی ''چکر'' سے جان چھٹی --البتہ کیس ''نمو جی'' کے حوالے کر دیا گیا اور اس نے ''شبانہ'' کو اگلے روز طلب کر لیا ،مہناز اس طلبی پر پریشان تھی کہ وہ شبانہ کو یہ پیغام کیسے دے؟ لیکن اس نے مجبوراً شبانہ کو بتا ہی دیا کہ کل صبح تمہیں ''نمو جی'' نے بلایا ہے--- شبانہ گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھی اور چکرا کر زمین پر گر گئی۔ ان لمحات میں مہناز کی آنکھیں بھی اندھیری ہو گئیں اس نے گھبراہٹ میں ''میڈم زبیدہ'' کو اطلاع دی فوری طور پر ڈاکٹر کو بلایا گیا جس نے معائنے کے بعد بتایا کہ شبانہ ''ڈپریشن'' میں ہے لیکن اس کا ''بلڈ پریشر'' بہت زیادہ ہے، میڈم زبیدہ نے فوری ریسکیو 1122 کو کال کی اور وہ فوری طور پر شبانہ کو کسی سرکاری ہسپتال لے گئے اس حادثے نے ''دارالامان'' کے ماحول میں ''سناٹا'' پیدا کر دیا۔ مہناز چند دنوں کے ساتھ پر رنجیدہ تھی پورے ایک ہفتہ یہی اطلاع ملتی رہی کہ ''شبانہ'' انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں ہے اور اس کا ''بلڈ پریشر'' ابھی تک نارمل نہیں ہو رہا پھر سی ٹی سکین اور دوسری رپورٹس آئیں تو پتہ چلا کہ اس کے دماغ کی شریان پھٹ گئی ہے۔ مہناز نے اجازت لے کر خصوصی دعا کا اہتمام کیا لیکن دعائیں رنگ نہیں لائیں اور شبانہ راہِ محبت میں جان کی بازی ہار گئی۔ چند روز ''دارالامان'' کا ماحول انتہائی اداس رہا پھر پہلے کی طرح کام شروع ہو گئے تاہم مہناز کو اس ناگہانی موت سے زیادہ اپنی محنت کے رائیگاں جانے کا دکھ تھا۔ شبانہ بے گھر اور لاوارث تھی اس لئے کہ اس کی دی ہوئی تمام اطلاعات فرضی تھیں لواحقین کی تلاش میں ''میت'' کو پوسٹ مارٹم کے بعد ڈیڈ ہاؤس کے حوالے کر دیا، قواعد و ضوابط کے مطابق کچھ روز میت رکھی گئی پھر ایک خاص مدت کے بعد اسے ''لاوارث'' قرار دیکر سپردِ خاک کر دیا گیا۔

☆☆☆☆☆

ایک رات کا طوفان

برگد اور دریک کے درختوں کے چھوٹے سے جھنڈ کے پار، کچی سڑک کے دوسری طرف بہت سارے بے ترتیب، اونچے نیچے، کچے پکے گھروں میں سے ایک گھر، جو دائیں بائیں اور پیچھے سے تین گھروں میں گھرا ہوا تھا، کے ایک پکے کمرے کا دروازہ مضبوط کاٹھی والا تھا اور اس کی سنگل اس سے بھی مضبوط تھی کہ گھر کا قیمتی سامان، اتنا قیمتی سامان جو ایک گاؤں کے باسیوں کے لئے جتنا ہو سکتا ہے، اسی کمرے کی عقبی دیوار کے ساتھ ایک دوسرے کے اوپر ٹکے ٹرنکوں میں رکھا ہوا تھا۔ ٹرنکوں کے آگے بچھی چارپائیوں پر پھول دار چادریں ڈلی ہوئی تھیں۔ چارپائیوں کے سرہانے رکھے تکیوں کے غلاف سفید کپڑوں کے تھے اور ان پر سرخ اور پیلے رنگ کے پھولوں کی کڑھائی کی گئی تھی۔

کمرے کا فرش پختہ نہیں تھا لیکن کچا بھی گھر والوں کی نفاست اور صفائی کا خوبصورت نمونہ پیش کرتا تھا۔ اس کمرے کا دروازہ اکثر بند ہی رہتا کہ اس کا استعمال صرف خاص مہمانوں کی آمد کے موقع پر ہی کیا جاتا تھا۔ یہ خاص مہمان بہت کم آتے تھے۔ تکیوں کے غلافوں کو میلا ہونے سے بچانے اور کچے فرش کو شیشے کی مانند ستھرا رکھنے میں زبیدہ بی بی کی بیٹی زینت بی بی کا کمال تھا۔ اٹھارہ سال کی خالدہ بی بی بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی اس لیے زبیدہ بی بی اور اس کے شوہر رحیمو کے بعد گھر کے باقی پانچ افراد، یعنی اس کے اپنے پانچ بہن بھائیوں پر اسی کا حکم زیادہ چلتا تھا۔

اُس منحوس صبح، یہ رحیمو، زبیدہ بی بی، خالدہ بی بی اور اس کے چھوٹے پانچ بہن بھائیوں کے لئے ایک منحوس صبح ہی تھی۔ رحیمو معمول کے مطابق چودھری کے کھیتوں میں کام کر رہا تھا۔ زبیدہ بی بی صحن کے کونے میں بنے پکی مٹی کے چولہے پر روٹیاں پکا رہی تھی اور خالدہ بی بی ان چار پانچ

انعام الحسن کاشمیری

گھروں کے پچھواڑے کے کھیتوں سے فراغت کے بعد، کہ صبح صبح پیٹ کی گندگی چھپانے کے لئے یہی کھیت کام آتے تھے، صحن میں بچھی چارپائی پر آلتی پالتی مارے بیٹھی کسی کپڑے پر کوئی پھل بوٹا کڑھائی کر رہی تھی۔ پچھواڑے والے گھر سے آنے والی ایک خاتون گھر میں داخل ہوئی اور خالدہ بی بی پر اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے سیدھا زبیدہ بی بی کے پاس چولہے کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔ وہ خاتون کچھ لمحوں تک روٹیاں پکتی دیکھتی رہی۔ اس کے بعد اُس نے زبیدہ بی بی کو اپنی جانب مخاطب کیا اور بڑے گلوگیر لہجے میں بولی:۔

''وے زبیدہ.....! تو روٹیاں بعد میں پکانا کہ کیا پتا یہ کسی کو نصیب بھی ہوتی ہیں کہ نہیں۔'' یہ بڑی خوفناک بات تھی۔ زبیدہ بی بی کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے روٹی توے پر ہی چھوڑ دی اور عورت کی طرف منہ کر کے پوچھنے لگی۔ ''اللہ نہ کرے یہ روٹیاں ہمارے نصیب میں نہ ہوں..... تجھے کالے کلمے منہ سے نہیں نکالنے چاہیے۔ مگر بتا! خیریت تو ہے نا.....؟''

آنے والی خاتون نے ایک نگاہ بیرونی دروازے پر ڈالی اور پھر کہنے لگی ''تیری کالی کلوٹی نے آج وہ چاند چڑھایا ہے، کہ جس نے بھی سنا کانوں کو الٹے ہاتھ لگا دیے۔'' زبیدہ بی بی کے کان شائیں شائیں کرنے لگے۔ قدم من بھر کے ہو گئے۔ اس کا وجود گویا ٹنوں وزن کے نیچے آ گیا اور اس کے کندھوں کو گویا ہزاروں ہاتھوں نے دبا لیا۔ وہ پیڑھی سے بامشکل اتر کر کچی اینٹوں کے فرش پر ہی ڈھیر ہو گئی۔ خالدہ بی بی دوڑ کر ماں کے پاس آئی اور اسے اٹھانے لگی۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ پڑوسن نے اس کی ماں سے کیا کہا ہے۔ اس نے ماں کو پانی پلانا چاہا لیکن وہ ہونٹوں سے ہی بہہ گیا۔ اٹھانے کی کوشش کے باوجود وہ اس کا بھاری بھرکم وجود ہلا تک نہ سکی۔ توے پر رکھی روٹی کوئلہ بن گئی اور چولہے میں سلگتی آگ دھیرے دھیرے ٹھنڈی پڑنے لگی۔

☆☆☆

خالدہ بی بی ابھی اپنی ماں کو اٹھانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی کہ چاچا نصیر مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں پھل والی لاٹھی تھی اور کندھوں پر صافہ پڑا ہوا تھا۔ خالدہ بی بی فوراً اس کی طرف لپکی اور چاچا نصیر، چاچا نصیر کہتے ہوئے اپنی ماں کی حالت کے بارے میں بتانے لگی۔ قریب پہنچتے ہی چاچا نصیر نے ''حرامزادی'' کہتے ہوئے اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ جڑ دیا اور خالدہ بی بی زور سے اس کمرے کے دروازے پر جا لگی جسے وہ کبھی کبھی، جب کبھی مہمان آتے کھولا کرتی تھی۔ وہ اپنے رخسار سہلاتے اور اوپر والے پھٹے ہونٹ سے رسنے والے خون کو صاف کرتے حیران و پریشان

چاچا نصیر کی طرف دیکھنے لگی۔

''بتا..... بتا حرامزادی..... تو کب سے یہ سب کر رہی تھی۔؟'' چاچا نصیر گرجا لیکن وہ جواب دینے کی حالت میں نہیں تھی۔ گویا اس کی قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے بس اپنے سر کو ذرہ سا ہلا دیا۔

''بتا نا..... بتاتی کیوں نہیں..... تو کب سے اپنا منہ کالا کر رہی تھی؟''۔ چاچا نصیر پہلے سے بھی زیادہ زوردار آواز میں گرجا۔ دروازے کے آگے کچی اینٹوں کے فرش پر پڑی لڑکی کے پلے کوئی بات نہیں پڑ رہی تھی۔ اسے سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ اس سے کیا پوچھا جا رہا ہے جس کا وہ جواب دے۔ تاہم وہ اتنا سمجھ گئی تھی کہ بات کھیتوں میں لڑائی والی نہیں، کچھ اور ہے۔

اتنی دیر میں دو تین عورتیں اور پانچ سات مرد بھی آ گئے۔ وہ سب خالدہ بی بی کو برا بھلا کہنے لگے۔ پچھواڑے والی پڑوسن نے مشورہ دیا کہ لڑکی کو اندر کمرے میں لے جا کر تفتیش کر کے بات اگلوائی جائے چنانچہ اسی پڑوسن نے خالدہ بی بی کو چٹیا سے پکڑا اور اُسی کمرے میں پہنچا دیا جس کی صفائی و ستھرائی اور زیبائش و آرائش پر خالدہ بی بی بہت دھیان دیتی تھی۔

''لے اب بتا..... اس سے پہلے کہ میرا ہاتھ دوبارہ اٹھے اور تیرے منہ ناک کا نقشہ بگڑ جائے، بتا کہ وہ حرامی کون ہے۔؟'' چاچا نصیر مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔

''چاچا تو کیا پوچھ رہا ہے۔ مجھے کچھ پتا نہیں.....'' اِس سے پہلے کہ جملہ مکمل ہوتا چاچا نصیر کا ہاتھ اٹھا اور خالدہ بی بی کا سر ٹنکوں کے آگے بچھی چارپائی کے پائے کے ساتھ جا ٹکرایا۔ اس نے چارپائی کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن چادر اس کے ہاتھ میں آ گئی جسے اس نے کھینچ لیا۔ چادر اور اس پر سفید غلاف میں لپٹا تکیہ نیچے فرش پر گر گئے اور مٹی سے اٹ گئے۔

درد کی تیز لہر اس کے سر میں ابھری اور وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گئی۔ خون کی دھار ابھری اور اس نے سارے بالوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایک دھار نے چہرے کا رخ کیا اور ساری جگہوں کو رنگین کر دیا۔ داہنی رخسار پر انگلیوں کے نشان واضح ہو گئے اور پھٹے ہوئے ہونٹ سے رسنے والا خون سر کے خون میں شامل ہو گیا۔

کچھ دیر بعد اسے ہوش آیا تو پتا چلا کہ کمرہ اڑوس پڑوس کے، اس کی برادری کے اور گاؤں کے دیگر لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔ اسے باہر سے بہت سی عورتوں کے بولنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں جن میں اس کی مانوس اور نامانوس سب شامل تھیں۔ اس کے قریب ہی میز پڑا تھا جس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور اس پر رکھا گلدان فرش پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ ہوش میں آنے کے

بعد اس نے آنکھوں کی پتلیاں گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر دھیرے دھیرے پیچھے کو سرکنے لگی۔ وہ چارپائی کو پائنتی کی جانب سے پکڑ کر کھڑا ہونے کی کوشش میں تھوڑا سا لڑکھڑائی لیکن پھر ہمت کر کے چارپائی پر سے ہوتی ہوئی پیچھے رکھی بڑی سی پیٹی پر چڑھ گئی۔ پیٹی پر چڑھنے کے بعد جب چاچا نصیرے نے اس سے دوبارہ وہی پہلے والی بات پوچھی اور خالدہ نے ہونق بنے اپنا سر دائیں بائیں ہلایا تو چاچے نے اسے پکڑ کر نیچے کھینچ لیا۔ وہ دھڑم سے کچے فرش پر گری اور اس کے کپڑے.....بس وہ عریاں ہو جانے کے بعد پھر سے اپنا وجود ڈھانپنے کی کوشش میں کسی نہ کسی حد تک کامیاب ہو گئی تھی۔ اس کوشش میں اسے نیچے گرنے سے لگنے والی چوٹ اور تکلیف کا کوئی احساس بھی نہیں رہا تھا۔ اسے بس احساس تھا تو اپنے بدن کا.....! اُس نے ہاتھ جوڑ کر اور قسمیں اٹھا کر چاچے نصیرے کو یقین دلانے کی کوشش کی لیکن کمرے میں موجود بیس پچیس مردوں کو یقین تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

☆☆☆

خالدہ بی بی کو پنچایت کے لیے چودھری کے ہاں لے جایا گیا۔ گاؤں کے سب بڑے بوڑھے وہاں جمع ہوئے۔ چودھری ساری بات سننے کے دوران بس مونچھوں کو تاؤ ہی دیتا رہا اور اس کی کرسی بدستور ہلتی رہی۔ چاچا نصیر نے اسے بتایا تھا کہ لڑکی سچ نہیں اگل رہی اس لئے بہتر یہی ہے کہ اسے آج رات حویلی میں ہی رکھ کر بات اگلوانے کی کوشش کی جائے۔ چودھری نے جب یہ بات سنی تو اس کی ہلنے والی کرسی اور مونچھوں کو تاؤ دینے والا ہاتھ اور تیز ہو گیا۔ خالدہ بی بی چیخی، چلائی، روئی، ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتی اور دہائیاں دیتی رہی کہ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ کوئی غلط کام نہیں کیا اس لئے اسے حویلی میں نہ چھوڑا جائے لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔ جب چاچا نصیر کے اشارے پر باقی لوگ الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگے تو وہ ایک ایک آدمی کا دامن پکڑ کر پکارتی رہی اور مدد کی فریاد کرتی رہی لیکن کوئی بھی رکا نہیں۔

☆☆☆

آدھی رات کے بیتتے ہی بادل اس زور سے گرجے کہ گہری نیند سوئے ہوئے سارے لوگ جاگ گئے اور ایک دوسرے کو خبردار کرنے لگے کہ اب عذاب اترنے والا ہے۔ وہ لڑکی واقعی گناہ گار ہے اور اس نے ہم سب کو اس مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ چودھری کی حویلی کے عین اوپر بجلی اس طرح چمکی کہ دن کا گمان ہونے لگا اور اس کے بعد اس زور سے بادل گرجے کہ ماؤں نے اپنے نونہالوں کو کلیجوں کے ساتھ چمٹا لیا۔ اب بارش شروع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی تیز ہوا چلنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں گلیاں پانی

سے بھر گئیں۔ کھیت ندیوں کا منظر پیش کرنے لگے اور کچے گھروندوں میں رہنے والے چھتوں سے محروم ہونے لگے۔ خوفناک بارش نے بہت سے گھر زمین برابر کر دیے اور تیز آندھی نے بہت سے درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ ڈالا۔ پورے گاؤں میں ہڑبونگ مچ گئی۔ ہر شخص پناہ کی تلاش میں کسی بلند اور محفوظ جگہ کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اسے اپنے بیگانے کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ لوگ معافی مانگنے اور فریاد کرنے لگے کہ ایک دفعہ ان کی اس عذاب سے جان بچ جائے تو وہ صبح ہوتے ہی بدبخت خالدہ اور اس کے گھر والوں کو گاؤں سے نکال دیں گے لیکن جوں جوں وہ دعا کرتے طوفان پینترے بدل بدل کے وار کرنے لگا۔ پو پھٹنے تک آدھے سے زیادہ گاؤں غرقِ آب ہو گیا۔

اگلے ہی دن گاؤں والے چودھری کے ہاں جمع ہوئے اور فریاد کی کہ مجرمہ کو والدین سمیت گاؤں سے نکال دیا جائے ورنہ طوفان پھر سے انھیں کسی بڑی مصیبت میں مبتلا کر ڈالے گا۔ چودھری ایسا نہیں چاہتا تھا لیکن جب بڑے بوڑھوں نے اس پر دباؤ ڈالا تو اسے بادلِ نخواستہ اسے ماننا پڑا اور پھر خالدہ بی بی، اس کے بوڑھے باپ اور مجنوں کی طرح آنکھیں گھماتی ماں کو گاؤں سے نکال دیا گیا۔

سب لوگ بے حد مسرور تھے کہ دوسری رات گاؤں میں طوفان نہیں آیا۔ طوفان کو للکارنے والے لوگ اب گاؤں میں نہیں رہے تھے۔ گاؤں اب غلاظتیں پھیلانے اور اللہ کے عذاب کو دعوت دینے والوں سے پاک صاف ہو گیا تھا۔ اب گاؤں والے چین کی نیند سونے لگے کہ انہوں نے شیطان کے پجاریوں کو دیس نکالا کر دیا تھا۔

طوفان والی رات کے کوئی چھ مہینے بعد کی بات ہے۔ گاؤں میں مشہور ہو گیا کہ چودھری کی بڑی بیٹی، جس کی ابھی شادی بھی نہیں ہوئی، نے چھ ماہ کا بچہ ضائع کروایا ہے۔ گاؤں میں یہ بات اس حکیم کے ملازم نے پھیلائی تھی جس نے لڑکی کو بچہ ضائع کرنے کی پڑی لا کر دی تھی۔ خالدہ بی بی نے اپنے ماں باپ کو ساری بات سچ بتا دی تھی اس لئے اب اسے کوئی خوف یا کھٹکا نہیں تھا چنانچہ رحیمو بھی اسی حکیم سے بچہ ضائع کرنے کی دوائی لے کر گیا جب زبیدہ بی بی نے اسے بتایا کہ ان کی بیٹی امید سے ہے۔ دوائی نے کوئی کام نہ کیا اور طوفان والے واقعہ کے ٹھیک نو ماہ بعد خالدہ بی بی نے ایک صحت مند بچے کو جنم دے دیا۔ دیکھنے والوں نے صاف دیکھا کہ بچے کی شکل ہو بہو اس چودھری سے ملتی ہے، جس کی حویلی میں خالدہ بی بی نے وہ رات گزاری تھی جس رات گاؤں میں طوفان آیا تھا۔

☆☆☆☆

زخمی رات [افسانچہ]

آسمان کے سیاہ ماتھے پر چمکتا جھومر زمین پر موجود کسی تالاب میں اپنا عکس دیکھ رہا تھا۔ یخ بستہ ہوائیں کسی کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔ اس پورے احاطے میں امن ٹانگیں پھیلائے سو رہا تھا اور سکون گیٹ پر چوکیداری کر رہا تھا۔ میں کمرے کی کھڑکی سے؛ خود پر غرور کرنے والے چاند کا عکس تالاب میں دیکھ رہا تھا اور چاہ رہا تھا کہ یہ منظر شعور سے فلٹر ہو کر میرے لاشعور کا حصہ بن جائے۔ انھی سوچوں میں غرق تھا کہ اچانک تالاب مکمل روشن سرخ رنگ میں تبدیل ہو گیا اور کسی اجنبی کی لاش رفتہ رفتہ پانی پر تیرنے لگی۔ اس کی آنکھیں رخساروں تلک لٹکی ہوئی تھیں اور ناک کی جگہ کان لگا ہوا تھا اور سینہ چاک تھا جس کے اندر چھوٹی مگر بڑے دانتوں والی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ میں نے فوراً کھڑکی کے آگے پردہ کر دیا اور اپنے کمرے میں جا کر رضائی اوڑھ کر لیٹ گیا؛ میرے دانت کپکپانا شروع ہو گئے اور پورا جسم اس بوڑھے انسان کے ہاتھوں کی طرح کانپنے لگا جو عشے کا شکار ہو جاتا ہے۔

یہ آج میرے ساتھ پہلی دفعہ نہیں ہوا، اس سے ایک ہفتہ قبل میں نے عشاء کی نماز پڑھ کر مسجد سے جوں ہی قدم باہر رکھے تو مسجد کا دروازہ خود ہی بند ہو گیا تھا۔ گلی میں جتنے مکان تھے ان سب کی بتیاں بند ہو گئی تھیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے اردگرد بہت بڑے بڑے چمگادڑ پرواز کر رہے ہیں کیونکہ مجھے تیز ہوا کے جھونکے محسوس ہو رہے تھے اور ہوا سے میری قمیض جھنڈے کی طرح لہرا رہی تھی۔ مارے خوف کے میرا حلق سوکھ گیا تھا۔ میں نے مسجد کا دروازہ کھولنا چاہا تو دروازہ آرام سے کھل گیا اور مجھے تسلی ہوئی لیکن جونہی میں نے ایک قدم اندر رکھا تو دروازہ واپس زور سے میرے منہ پر بجا اور میں باہر زمین پر بے دردی سے گرا اور اپنی زخمی ناک پکڑ لی تھی۔ میں وہاں سے بھاگا اور ایک دوسری گلی میں داخل ہو گیا۔ وہاں بھی سب روشنیاں گل تھیں بس ایک بلب روشن تھا۔ اس بلب کی روشنی کے نیچے ایک چھوٹا بچہ کھڑا تھا۔ جس نے سُرخ شلوار قمیص پہنی تھی اور بہت لمبے بال تھے جس وجہ سے اس کا چہرا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک دم اس کے بالوں سے چھوٹی چھوٹی جوئیں نکلیں جو آن کی آن میں مرغے جتنی بڑی ہو گئیں اور اس بچے کا سر زمین پر گر گیا اور جوئیں میرے پاس آنے لگیں کہ میں وہاں سے تیسری گلی میں فرار ہو گیا۔ میں بھاگتا گیا، میرا دل مجھ سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اس دن بہت مشکل سے جان بچا کر اپنے گھر پہنچا تھا۔

عمار نعیمی

مجھے معلوم ہے کہ میرے ساتھ یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ اس کے تدارک کے لیے ایک دن میں پڑھائی کرنے کے لیے حویلی گیا۔ حویلی میں بوم کی آوازیں دریا کی موجوں کے مانند گونج رہی تھیں۔ تاریکی نے حویلی میں کریفیو لگا رکھا تھا۔ میرے چند قدم چلنے کے بعد میری ٹھوکر کسی چیز سے لگی۔ مجھے احساس ہوا کہ جیسے یہاں کسی کی لاش پڑی ہے؛ میں نے موبائل کی ٹارچ جلا کر دیکھا تو میرے اوسان خطا ہو گئے اور قدموں تلے زمین نکل گئی کیونکہ وہ مردہ انسان نہیں بلکہ ایک مردہ کوا تھا جس کے پورے جسم پر سوئیاں چبھی ہوئی تھیں اور اس کے ماتھے پر میرا نام لکھا تھا اور کچھ سمجھ میں نہ آنے والی علامات بنی ہوئی تھیں۔ میں سکتے ہی میں تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ کوئی سرعت سے میرے قریب سے گزرا ہے۔ میں نے موبائل کی روشنی سے اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس تاریکی میں مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ میں نے دوبارہ موبائل کی روشنی مردہ کوے کی طرف کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں اب کوا ہے ہی نہیں اور وہی سر کٹا بچہ جو میں نے گلی میں دیکھا تھا وہ میرے سامنے سلامت سر کے ساتھ کھڑا ہے۔ میری آنکھیں اس بیل کی طرح باہر کو آ گئیں جب اس کو ذبح کرنے کی غرض سے ٹانگیں رسیوں سے باندھ کر زمین پر لٹا دیا جاتا ہے۔ اس لڑکے کے چہرے پر کسی نے بے دردی سے خنجر مارے ہوئے تھے اور اس کی ناک اور آنکھیں لٹکی ہوئی تھیں اور گردن پر جوئیں ہی جوئیں تھیں۔ میرا سر بھاری ہونا شروع ہو گیا لیکن میں نے خود کو سنبھالنے کی بھرپور کوشش کی اور وہیں بیٹھ کر چلے کے الفاظ پڑھنے لگا۔ جب میں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو وہ بچہ غائب تھا۔ میں نے پھر اس دن اپنے گرد ایک حصار کیا جس کے سبب میں آج زندہ سلامت گھر پر ہوں اور اپنی رضائی میں لیٹا ہوا ہوں۔

یہ وہی بچہ تھا جس کو میں نے کالے جادو سے بچایا تھا۔ ایک عامل نے اس بچے پر کالا جادو کر رکھا تھا اور میں نے اس بچے کو اپنے روحانی علم سے کالے جادو کی گرفت سے نکالا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ میرے ساتھ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہو رہا ہے کیونکہ اس کالا جادو کرنے والے عامل نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اس بچے سے دور رہو لیکن میں نے اس عامل کو اپنے کامل یقین سے کہا تھا کہ میں اسے کچھ نہیں ہونے دوں گا تو اس بات پر اُس عامل نے مجھے میری جان کی دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا کہ جب تم زندہ بچ گے تو تب نا۔ اب تالاب میں تیرتی لاش دیکھ کر مجھے لگتا ہے کہ ایک بار پھر مجھے حصار کر لینا چاہیے ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس کے بدن میں سرسراہٹ شروع ہوئی اور ایک گرم خون کا چھینٹا چھت سے اس کے ماتھے پر آ گرا۔ ابھی وہ خون کا چھینٹا صاف کر ہی رہا تھا کہ چھت سے نوک دار ہنڈی والا پنکھا اس کے سر کے عین درمیان گرا اور اس کا سر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

سوشل میڈیا اور ہم

''تمہیں کیا رات کو بھی سکون نہیں ملتا۔ نہ خود آرام کرتی ہو اور نہ دوسروں کو کرنے دیتی ہو۔ جب دیکھو ٹک ٹک کرتی ہی رہتی ہو۔ تمہاری انگلیاں نہیں تھکتیں؟''

''کچھ نہیں مما بس سو جائیں آپ''۔

اس نے یہ کہہ کر موبائل تکیے کے نیچے رکھا اور سوتی بن گئی۔

دراصل اس نے ایک پوسٹ شیئر کی تھی۔ جس کے لائکس اور کمنٹس دیکھنے کے لئے وہ بار بار فیس بک کھول رہی تھی۔

صبح سویرے جب اس نے آنکھ کھولتے ہی کہا

''اف خدایا! میں کیا کروں؟ کدھر جاؤں؟ کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ میرا سر بھی چکرانے لگ گیا ہے۔''

''ارے واہ! سر تو چکرائے گا نہ دن دیکھتی ہو نہ رات۔ میں کب سے آوازیں دے رہی ہوں جو تمہیں سنائی نہیں دے رہیں۔ ہر وقت اپنے اس باپ کو کانوں میں ٹھونسے رکھتی ہو اور دنیا جہاں کی تمہیں کوئی خبر نہیں ہوتی۔ کوئی مرے یا جیئے تمہیں اس کی پروا نہیں۔ کبھی ساتھ ساتھ جھومتی ہو اور گنگناتی ہو۔ کبھی اسے بند کرتی ہو کبھی کھولتی ہو۔ کبھی خوش ہوتی ہو اور کبھی جھنجھلاتی ہو۔ تم بھی عجیب ہو۔''

''ماما میں آپ سے بات نہیں کر رہی نہ ہی میں آپ سے کچھ کہہ رہی ہوں۔''

''ہاں ہاں غم بھی تو اسی بات کا ہے کہ تم مجھ سے کچھ نہیں کہتیں۔ کچھ کہو تو میرا بھی وقت اچھا کٹ جائے۔''

''ابھی آپ کا وقت نہیں کٹتا۔ سارا دن کام کر کر کے؟'' اس نے اپنے موبائل سے نظریں ہٹائے بغیر کہا

''کٹتا ہے میڈم کٹتا ہے بس کٹتا ہی ہے۔ انسان رب سے اولاد کیا اس لئے مانگتا ہے کہ بڑھاپے میں بھی اپنی بوڑھی ہڈیاں خود ہی چٹخاتا پھرے اور منہ بند کر کے بیٹھا رہے۔''

ارے واہ ماما! حد ہو گئی۔ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ آپ بوڑھی ہیں۔ نہ آپ بوڑھی ہیں نہ آپ اپنی ہڈیاں چٹخایا کریں۔ خالہ سکینہ آتی تو ہیں۔ انہیں کام کرنے دیا کریں۔ جب تک آپ ان کے کاموں میں بھی گھس نہ لیں آپ کو چین نہیں آتا۔ پھر مجھ سے بھی توقع کرتی ہیں کہ میں بھی ایسا کروں۔ ایک تو میری پیاری ماما میرے

سمیرا کیانی

پاس اتنا وقت نہیں ہے دوسرے وہ پیسے کس چیز کے لیتی ہے؟ اگر ہمیں نے سارے کام کرنے ہیں تو۔۔۔۔"

"تمہیں سو دفعہ سمجھایا ہے کہ گھر ہمارا ہے۔ نوکرانیوں کی نگرانی نہ کرو تو وہ بھی چور ہو جاتی ہیں۔ تمہیں یہ بات سمجھ نہیں آتی؟"

"آتی ہے سمجھ آتی ہے۔ مگر جب ایک انسان کو ایک بار کام سمجھا دیا جائے تو وہ کر ہی لیتا ہے۔ اسے پتہ نہیں کہ وہ کام نہ کرے گی تو اسے کام سے فارغ کر دیا جائے گا۔"

"ارے بی بی! تم رہو اپنی واٹس ایپ اور فیس بک کی دنیا میں۔ تمہیں زندگی کے حقائق کا کیا پتہ؟ کام والیوں کے نخرے بھی ہمیں ہی اٹھانے پڑتے ہیں۔ ذرا سی سختی ہوئی وہ رفو چکر ہوئیں۔"

"تو جانے دیں کوئی نئی آجائے گی۔"

کوئی نئی کہاں سے آجائے گی؟ کیا راستے میں پڑی ہیں ماسیاں؟ سو سو نخرے اٹھانے پڑتے ہیں۔"

"کیا کہا؟ میں سن نہیں پائی میں بس اس ایک کمنٹ کا جواب دینے لگ گئی تھی۔"

"میں ایک ہی بات کو دس دس بار نہیں دہرا سکتی۔ دھیان تمہارا موبائل سے ہٹتا ہی نہیں ہے۔"

"ماما جانی! میں کوئی پوسٹ شیئر کرتی ہوں تو میرا جی چاہتا ہے کہ اس پر ڈھیر ڈھیر کمنٹس آئیں مگر یہاں تو ابھی چھ گھنٹوں میں ایک ہی کمنٹ آیا ہے۔"

اللہ کرے ایک بھی کمنٹ نہ آیا کرے۔"

"حد کرتی ہیں آپ بھی۔ میری ماں ہو کر آپ مجھے بد دعائیں دے رہی ہیں۔"

"بد دعا نہیں دعا ہے۔ تاکہ تم اٹھو اپنی پڑھائی اور گھر کے کام کاج میں بھی دلچسپی لو۔"

"لیتی تو ہوں اور کتنی لوں۔ ہر وقت کتابی کیڑا تو نہیں بن سکتی۔"

"کتاب کھولے بغیر ہی تم تو کتابی کیڑا بن گئی ہو۔"

"او ماما! یہ دیکھیں اس نے روہانسی ہوتے ہوئے ماں کو پکارا

"کیا ہوا؟ کیا دیکھوں" ماں نے اس کے پاس آتے ہوئے کہا

"ماما یہ دیکھیں عمارہ کو کتنے ڈھیر لائکس اور کمنٹس ملے ہیں۔ اس کی ایک ایک پوسٹ پر ہزار ہزار لائک ہوتے ہیں اور میری پر صرف ایک دو"

وہ روہانسی ہو گئی۔

"بے وقوف لڑکی اس سوشل میڈیا نے تو تمہیں نفسیاتی مریض بنا دیا ہے۔ چلو اٹھو چھوڑو اس کو۔"

"میں اس کو نہیں چھوڑ سکتی۔ میں اب عمارہ سے کئی گنا زیادہ لائک اور کمنٹ لے کر رہوں گی۔"

"کیا کرو گی تم؟ اس بکواس بک نے تو تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔"

"بکواس بک نہیں فیس بک ہے - آپ اسے بکواس بک مت کہیں پلیز- بس آپ دعا کریں کہ لوگ میری پوسٹس پر بھی ڈھیر ڈھیر---"

"بس اسی کام کے لئے دعا رہ گئی ہے؟"

"اچھا نہیں کرتیں تو نہ کریں- میں خود ہی کچھ کرتی ہوں"

"کیا کروگی؟"

"سب سے پہلے تو میں اپنے سارے خاندان کے لوگ ان فرینڈ کروں گی- جن کی چیزیں لائک کر کر کے میں تھک گئی ہوں مگر وہ بدلے میں بھی میری نہیں کرتے- پھر اس کے بعد میں بھی عمارہ کی طرح اپنے فوٹوز اپ لوڈ کیا کروں گی وہ بھی دوپٹے کے بغیر اور ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کو اپنا فیرینڈ بناؤں گی- جو میرے پاس دو ہزار فرینڈ ریکویسٹس آئی پڑی ہیں - وہ سب ایکسیپٹ کرلوں گی-

"بے وقوف لڑکی خبردار جو تم نے یہ حرکت کی- تم عائشہ اکرم کا حال بھول گئی ہو؟ کونسی عائشہ اکرم؟

"ارے وہ ہی مینار پاکستان والی - اس شہرت کے چکر میں کیسی بدنام ہوئی ہے؟"

"بدنام کہاں ہوئی ہے؟ اس کے فولرز کتنے بڑھ گئے ہیں - اس کے کتنے ہمدرد بھی تو موجود ہیں-"

"دو چار نام نہاد لبرل اور میرا جسم میری مرضی کا نعرہ لگانے والی دو چار عورتیں"

"کشور ناہید نے بھی اس کی ہمدردی میں ایک نظم لکھی ہے-"

"کس نے حمایت کی اور کس نے مخالفت؟ مجھے اس سے سروکار نہیں- وہ ایک متنازع شخصیت بن چکی ہے اور بدنام ہو چکی ہے- اس کی ملازمت بھی داو پر لگ سکتی ہے- میں تمہیں ایسی کوئی حرکت نہیں کرنے دوں گی-"

"کیا ہے امی؟ میں ویسا کچھ نہیں کر رہی؟"

"یہ تصویریں لگا کر اپنی نمائش کرنا اور نامحرموں سے داد وصول کرنا یہ کیا ہے؟ لڑکی کے ساتھ کچھ برا ہو جائے تو ننانوے فیصد پاکستانی لڑکی ہی کو مجرم گردانتے ہیں- نادان لڑکی تم ابھی ان باتوں کو نہیں سمجھتیں- ابھی دیکھنا تم اب میں کیا کروں گی-----"

"کیا کریں گی آپ؟"

"پہلے تمہارا جیب خرچ بند کروں گی پھر تمہارا موبائل لوں گی پھر تمہیں یہاں سے چلتا کروں گی- اب تمہیں مزید آزادی نہیں دی جاسکتی-"

"کیا کہا ماما؟ کیا کہا؟"

"لیجئے جناب ملیے ہماری امی حضور سے - یہ اکیسویں صدی کی ماں نہیں بلکہ سولہویں صدی کی امی حضور ہیں- اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی ماں کا فوٹو فیس بک پر اپ لوڈ کر دیا-

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے نلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورگورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانح عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

ہر چند کہ ان کی تربیت کے لئے اکیڈمی ہے لیکن یہ سمجھتے ہیں کہ ایک دفعہ امتحان پاس کر لینا ہی کافی ہے۔ باقی ٹریننگ محض گپ شپ تک محدود رہنی چاہئے۔ کافی عرصہ پہلے سول سروس کے لڑکوں کے لئے ملٹری ٹریننگ ضروری تھی۔ ایک بیچ کاکول گیا تو چند روز میں ہی وہاں کے سخت نظم وضبط سے گھبرا گیا اور بغیر بتائے بھاگ آیا۔ ان دنوں سیکرٹری اسٹیبلشمنٹ ایم ایچ صوفی ہوتے تھے۔ انہوں نے جواب طلبی کی بجائے انہیں پشاور رورل اکیڈمی میں بھیج دیا۔ اکیڈمی کے ڈائریکٹر راجہ افضل تھے۔ کورس کے اختتام پر ضابطے کے تحت سب کو

محکمانہ امتحان دینا تھا۔ سب نے انکار کر دیا۔ بات صوفی صاحب تک پہنچی تو انہوں نے کسی مصلحت کے تحت امتحان دینے کا حکم دیا۔ راجہ صاحب بتاتے ہیں پہلے دن ہی پہلے پرچے میں سب نے ایک سوال ایک سطر میں حل کیا۔ جواب مشترکہ تھا ''یہ نہایت تھرڈ کلاس اکیڈمی ہے جہاں تھرڈ کلاس لوگ گھٹیا تربیت دیتے ہیں۔'' پرچے صوفی صاحب کو بھجوائے گئے۔ انہوں نے بتقاضے انصاف فیصلہ کیا کہ آج کے بعد راجہ افضل کو کسی اہم پوسٹ پر تعینات نہ کیا جائے۔

ایک مرتبہ سول سروس کی ریفارمز کے لئے کمیشن بنا تو اس کا سربراہ جسٹس اے آر کارنیلیئس تھا۔ راجہ افضل اس کے ممبر تھے۔ ان کی رپورٹ کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا گیا۔ یہ جج صاحب کو بھٹی اور راجہ افضل کو ہندو بولتے تھے۔ ان کی دیدہ دلیری اور رعونت کا یہ عالم تھا کہ اسمبلی سیشن کے دوران ہوم سیکرٹری یزدانی نے اُچ شریف کے ایم پی اے مخدوم گیلانی کو زنانے دار تھپڑ جڑ دیا۔ جب نواب کالاباغ گورنر بنا تو اس کے پیشرو اختر حسین نے بریفنگ کے دوران اسے متنبہ کیا کہ چیف سیکرٹری خورشید سے ہشیار رہیں۔ یہ گورنر کو کبھی خاطر میں نہیں لاتا۔ ایک دو مرتبہ نواب صاحب نے اسے بلایا تو وہ بو لگائے پائپ پیتا ہوا دفتر میں آیا اور ہر اُردو سوال کا جواب شاندار انگریزی میں دیا۔ پائپ سے نکلتا ہوا دھواں اور اس کے منہ سے نکلتے ہوئے دھوئیں کے مرغولے نواب صاحب کو بڑے ناگوار گزرے۔ ایک دو مرتبہ تو برداشت کر گئے لیکن جب تیسری مرتبہ اُس نے اپنی روش نہ بدلی تو نواب صاحب کی مونچھ حرکت میں آئی۔ اس کو مخاطب کرتے ہوئے بولے ''دیکھو! اگر میں گھر چلا گیا تو میں نواب ہی رہوں گا لیکن اگر تمہیں فارغ کر دیا گیا تو تم گھر جا کر کیا کرو گے؟ کیا گھانڑی پیڑو گے؟'' (کیا کولہو میں سے تیل نکالو گے)۔ اسے بالآخر نوکری سے فارغ کر دیا گیا۔ جب انکوائری شروع ہوئی تو پتہ چلا کہ زرکثیر خرچ کر کے اس نے سرکاری رقم سے اپنے گھر میں ایک سوئمنگ پول بنایا تھا۔ جس میں شام کو اپنی انگریز بیوی کے ساتھ ڈبکیاں لگایا کرتا تھا۔

اس سروس نے موقع کی مناسبت سے ہر قسم کی کھیپ تیار کر رکھی ہے۔ اگر کوئی درویش منش چیف منسٹر آ جاتا تو چند مولوی ٹائپ، باریش افسر اس کے حضور پیش کر دیے جاتے جنہوں نے نہایت موثر انداز میں زہد وتقویٰ کا سوانگ رچایا ہوتا۔ جی ایم سکندر کی داڑھی دیکھ کر اگر کوئی یہ سمجھے کہ یہ پابند صوم و صلوٰۃ ہے تو اس میں غلام محمد سکندر کا کوئی قصور نہیں، محض اس شخص کی عقل کا فتور ہوگا۔ اگر نواب صادق قریشی آ جائے تو پھر جاوید اکرم ٹائپسی ٹائپ افسروں کی کھیپ پہنچ جائے گی جو سورج کے غروب ہوتے ہی

طلوع ہو جاتے ہیں اور شغل شب میں نواب صاحب کے ہم مشرب و ہم پیالہ بنتے ہیں۔ نواب صاحب ایک دفعہ بتانے لگے "جب وہ وزیر اعلیٰ بنے تو بھٹو نے انہیں جو پہلی نصیحت کی وہ یہ تھی کہ اس قسم کے چھوٹے افسروں کے ساتھ بیٹھ کر شراب پینا چھوڑ دو۔ اگر جھک مارنی ہی ہے تو اکیلے بیٹھ کر کر لیا کرو۔"

بولے "یہ سن کر میرے پاؤں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔ اس شخص کی انٹیلی جنس کا یہ عالم تھا کہ اسے اس بات کا بخوبی علم تھا کہ شام کو ہوٹل انٹرنیشنل میں ہم اکٹھے شراب پیتے ہیں۔" اگر کبھی کبھار وزارت اعلیٰ حنیف رامیوں کی جھولی میں آن گرتی تو پھر دیسی "ہنری کسنجر" پرنسپل سیکرٹری کا قلمدان سنبھال لیتے۔ ایک دفعہ بھٹو صاحب نے شاہد حامد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے طنزاً کہا "سنا ہے تم نے ہنری کسنجر کو اپنا سیکرٹری بنا رکھا ہے" تو اس پر رامے جی نے یہ کہہ کر اس طنز کو پلٹ دیا "آپ کے پاس بھی تو ایک ہنری کسنجر ہے۔" ان کا اشارہ رفیع رضا کی طرف تھا۔ ہر چند کہ بات لطیف پیرائے کے گلزار میں ہوئی تھی لیکن نازک مزاج شاہاں تاب سخن نہ دارند۔ غالباً بھٹو صاحب نے اسی روز فیصلہ کر لیا کہ اس پینٹر کو واپس کینوس کی طرف دھکیل دیا جائے۔ ویسے بھی کھر کے تجربے کے بعد وہ پنجاب میں کسی شخص کو زیادہ دیر ٹکنے نہیں دیتے تھے۔

جنرل جیلانی نے ایم ایس چوہدری کی شکل میں جو خونخوار جانور پال رکھا تھا اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ان لوگوں کے پاس سازشوں، چاپلوسیوں، خوشامد اور مکر و فریب کا ایک ایسا جال تھا جس میں سے کسی حکمران کے لئے باہر نکلنا ناممکن تھا۔

انہوں نے ایمانداری کے بھی بڑے عجب معیار مقرر کر رکھے تھے۔ اگر کوئی مجسٹریٹ ہزار روپے رشوت لے لیتا تو وہ بڑی حقارت کے ساتھ کہتے He is a corrupt judical officer۔ کوئی ان سے یہ نہ پوچھتا کہ صاحب آپ جو شغل شب کرتے ہیں اس کا اہتمام کون کرتا ہے؟ کسی مزاح نگار نے منیر نیازی مرحوم کے بارے میں لکھا تھا "مرزا غالب جس چیز کے لئے دوستوں سے اُدھار مانگا کرتے تھے یہ وہ چیز ہی پکڑ لیتے ہیں۔" بڑے عرصے سے یہ قانون چلا آ رہا تھا کہ کسی بھی جائیداد کی خرید و فروخت کے لئے حکومت کی اجازت ضروری ہے۔ انہوں نے کوآپریٹو سوسائٹیاں بنا کر پنجاب کے سب بڑے شہروں میں بے حد قیمتی سرکاری زمین کوڑیوں کے بھاؤ لے لی۔ کالونیوں میں پلاٹوں کی بندر بانٹ شروع ہو گئی۔ چونکہ سوسائٹی کا چیئرمین ڈپٹی کمشنر ہوتا تھا وہ پنجاب کے سب سی ایس پیز کو پلاٹ الاٹ کر دیتا۔ اسی طرح اس کو پنجاب کے سب شہروں میں پلاٹ الاٹ ہو جاتے۔ جن کی

مالیت کروڑوں تک جا پہنچتی۔ ایک افسر جو آج کل میاں نواز شریف کا نفس ناطقہ بنا ہوا ہے اس کے پاس ۱۰۵ پلاٹ تھے۔ غلام حیدر وائیں وزیر اعلیٰ پنجاب نے ایک مرتبہ جب ان کی فہرست مرتب کرنا چاہی تو انہوں نے معلومات فراہم کرنے سے یکسر انکار کر دیا۔ بلکہ اس کے خلاف اُلٹا پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ وہ ان پڑھ وزیر اعلیٰ ہے جبھی تو سب سرکاری اُردو میں منگواتا ہے۔

سی ایس پی: کہنے کو تو یہ مرکزی سروس ہے لیکن اس کے فرد عملاً ساری زندگی اپنے اپنے صوبوں میں گزار دیتے ہیں اور مرکز یا دیگر صوبوں میں جانے کا نام تک نہیں لیتے۔ اگر کسی کی پوسٹنگ مرکز میں ہو جائے تو صف ماتم بچھ جاتی ہے۔ اس افسر کے کولیگ باقاعدہ تعزیت کرنے آتے ہیں۔ آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان وہ بتاتا ہے۔ صاحب ہم پر یہ برا وقت بھی آنا تھا۔ کیا اس جہنم میں جھونکنے کے لئے صرف میں ہی رہ گیا تھا۔ اسلام آباد دارالحکومت نہیں بلکہ سول سروس کا قبرستان ہے۔ آدمی ٹھیک طرح سے اپنی شناخت بھی نہیں کروا سکتا۔ طوہاً و کرہاً وہاں پہنچ بھی جائے تو پہلے دن سے ہی واپس پنجاب آنے کی منصوبہ بندی شروع کر دیتا ہے۔ کام میں اس نے کیا جی لگانا ہے۔ بچے ساتھ نہیں لے جاتا بلکہ جی او آر میں جہازی سائز کے محل نما بنگلوں میں چھوڑ جاتا ہے۔ ہفتے میں دو تین دن لاہور گزارتا ہے اور بقیہ دن سنٹرل سیکرٹریٹ میں بیٹھ کر آہیں بھرتا ہے۔ انہوں نے اپنی سہولت کی خاطر ایک رول نکالا ہے یہ کہ اگر افسر پانچ سال بھی باہر رہے تو اس سے بنگلہ خالی نہیں کروایا جائے گا۔ اس قسم کا یکطرفہ، غیر منطقی اور غیر اخلاقی ضابطہ اور کسی سروس میں نہیں۔ اگر کسی فوجی افسر کا تبادلہ ہو جائے تو اسے ایک مہینے میں گھر خالی کرنا پڑتا ہے۔ دراصل ان کا مسئلہ یہ ہے کہ جو موج میلہ پنجاب میں ہے وہ اور کہیں نہیں ہے۔ آٹھ دس کنال کے prime land میں بنگلے، نوکروں کی فوج ظفر موج، ڈرائیور، باورچی، مالی، مالشیے اور نوکرانیاں، خلاف ضابطہ کئی کئی گاڑیاں جو عیش پنجاب میں ہے اس کا باہر تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام آباد میں انہیں ایک ٹوٹی پھوٹی گاڑی، ایک کنال کا مکان وہ بھی اگر مل جائے تو! اور ٹھیک تین بجے دفتر کی کھڑکیاں بند کرنے والا چپڑاسی ملتا ہے۔ اس غریب آدمی کو دوسری شفٹ میں بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے رکشا چلانا ہوتا ہے۔ ریڑھی لگانی ہوتی ہے یا کسی پرائیویٹ دفتر میں کام کرنا ہوتا ہے۔ وہ صاحب بہادر کے اُٹھنے کا انتظار نہیں کر سکتا۔ صوبے میں اہلکار اس لئے بیٹھے رہتے ہیں کہ ان کے آفس ٹائم کے بعد آنے والے "ملاقاتی" انہیں کچھ نہ کچھ ٹپ کی شکل میں دے جاتے ہیں۔ ڈپٹی کمشنر کے نوکر، ڈرائیور تو تحصیلداروں تک

کو خاطر میں نہیں لاتے۔ وہ بھی ڈرتے ہیں کہ بدبخت عین وقت پر کہیں چغلی نہ کھا جائے۔ وہ بڑے مزاج شناس ہوتے ہیں۔ انہیں پتہ ہوتا ہے کہ کب کس کے خلاف بات کرنی ہے یا چند توصیفی جملے بولنے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ سروس میں کوئی قابل، ایماندار اور عالی ظرف افسر نہیں ہے۔ ان کے عمومی رویہ پر بحث کی گئی ہے۔ انہیں صفحات میں خالد محمود چیمہ، اسلم باجوہ، رضا علی و چند دیگر افسروں کی کھل کر تعریف بھی کی گئی ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو اور پرویز مشرف نے اس سروس کے پر کاٹنے کی کوشش کی لیکن ہر ایسی کوشش کے بعد پتہ چلا کہ ان کے اختیارات پہلے سے بھی زیادہ ہو گئے ہیں۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ یہ لوگ اس قدر منظم، چاپلوس، سازشی اور چالاک ہیں کہ جب ایک ہی بات کو یک زبان ہو کر دس مرتبہ دہراتے ہیں تو حکمران سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کہیں اس سے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی یا کسی قسم کی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوا۔ دوسری وجہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ ہر حکمران کے دائیں بائیں، اُوپر نیچے یہی لوگ ہوتے ہیں۔ دن رات اگر کوئی پالتو جانور بھی آدمی کے ساتھ رہے تو اسے اس جانور سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔ یہ آہستہ آہستہ غیر مرئی انداز میں آکاس بیل کی طرح اسے اپنے شکنجوں میں جکڑ لیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ادھر ہی دیکھتا ہے جدھر ان کی اُنگلی اُٹھتی ہے۔ وہی سوچتا ہے جو ان کی سوچ سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ یہ بات کہاں تک درست ہے آیئے ہم پاکستان کی تاریخ کا اجمالی جائزہ لیتے ہیں۔

یہ بات اب کوئی ڈھکی چھپی نہیں کہ لیاقت علی خان کو مروانے میں بیوروکریسی کا ہاتھ تھا۔ سکندر مرزا اور غلام محمد خود سول سرونٹ تھے۔ انہوں نے اس ملک کا جو حشر کیا وہ تاریخ عبرت کا ایک المناک باب ہے۔ ایوب خان بھی ملٹری بیوروکریسی کا کل پرزہ تھا۔ اس نے حکمرانی کی باگ ڈور قدرت اللہ شہابوں، الطاف گوہروں اور ایم ایم احمدوں کو دے رکھی تھی۔ Basic democracy کا شوشہ بھی ان کے اس گوہر یکتا نے چھوڑا جس نے اسے کتاب Friends not masters لکھ کر دی۔ کس قدر عجیب اتفاق ہے کہ پرویز مشرف کی کتاب In the line of fire بھی الطاف گوہر کے فرزند ارجمند ہمایوں گوہر نے لکھی۔ بھٹو قابل شخص تھا بالآخر ان کی چال میں آ گیا۔ جنرل الیکشن کے لئے اُمیدواروں کی فہرست ڈپٹی کمشنر مرتب کرتا تھا۔ ایک ڈی سی سارے ضلع کے ممبران اسمبلی پر بھاری تھا۔ اُمیدوار اس کے آگے پیچھے پھرتے۔ پہلے وہ محکموں کا کوارڈی نیٹر تھا۔ اس سسٹم میں انچارج بن گیا۔ تمام ضلعی سربراہان کی راسیں اس کے ہاتھ میں دے دی گئیں۔ اس کا واحد نقصان

پبلک کو ہوا۔ امن عامہ کی صورت حال دن بدن بگڑتی گئی۔ مالیہ کی وصولی نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ وہی پٹواری جو پہلے تحصیلدار وغیرہ کو کچھ دیتا دلاتا تھا اب اسے بے شمار لوگوں کی ہتھیلی گرم کرنا پڑ رہی ہے۔ یونین کونسل ممبر، تحصیل ناظم، ضلعی ناظم وغیرہ۔ ظاہر ہے پٹواری نے گھر سے لاکر تو کچھ دینا نہیں ہے، اس نے اپنے ریٹس پانچ گنا بڑھا دیے ہیں۔ یہی حال دوسرے محکموں کا ہے۔ اس تناظر میں کسی پی سی ایس افسر کا دس سال تک پنجاب کے بڑے اضلاع میں ڈپٹی کمشنر رہنا قریباً ناممکن تھا لیکن ایسا ہوا۔ ہر چیف سیکرٹری نے میری تعیناتی کی مخالفت کی یا پھر بے بسی سے کندھے اُچکا کر رہ گیا۔ اس تمام عرصے میں سوائے ضروری میٹنگوں کے نہ تو میں کسی چیف سیکرٹری کو ملا نہ اس کی ضرورت پیش آئی۔ جو لوگ کسی پی سی ایس افسر کی شکل دیکھنا گوارا نہیں کرتے اُن سے بہتر پوسٹنگ کی بھیک مانگنے کا کوئی جواز نہ تھا۔

اس کے لہجے سے کھنکتا ہے صدا رزق حرام
اس سے خیرات نہ مانگو کہ وہ گالی دے گا

.....

لیکن یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ چار سو سازشوں کے سنہری جال بچھے تھے۔ دام ہر موج میں سینکڑوں نہنگ اپنے حلقوم کھولے کھڑے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہر معرکہ از خود سر ہوتا گیا۔ ہر مسئلہ خود بخود حل ہوتا گیا۔ یہ ایک طویل سفر تھا۔ اس لمبے عرصے میں سروس کی پل صراط پر بحفاظت چلنا اور بحفاظت گزرنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ اس میں دو چار نہیں کئی مشکل مقام آتے ہیں۔ ذرا سی لغزش پا، تھوڑی سی کج روی، معمولی سی ذہنی اُپج کئی مشکلات کو جنم دے سکتی ہے۔ یہ سب مراحل کیسے طے ہوتے، یہ داستان عجیب بھی ہے اور دلچسپ بھی لیکن ایک بات کا اعتراف ضروری ہے۔ بتقاضائے بشریت غلطیاں بھی ہوئیں اور کبھی کبھی سیدھے راستے سے ہٹ کر بھی چلنا پڑا۔ رولز اینڈ ریگولیشن کی صریحاً خلاف ورزی نہ بھی کی تو ان میں لچک ضرور پیدا کی۔ الیکشن میں کبھی جھرلو تو نہ پھیرا لیکن حکومت کو چند داؤ پیچ ضرور بتائے۔ اس تمام عرصے میں ایک چیز کی سختی سے حفاظت کی۔ عزتِ نفس! اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا مجھ پر خاص کرم رہا۔ شیخوپورہ کے ڈپٹی کمشنر خواجہ صدیق اکبر نے ایک دفعہ برملا کہہ دیا وہ میاں نواز شریف کا خادم ہے۔ اس پر اخباروں میں بڑی لے دے ہوئی۔ جب کسی صحافی نے اس بیان کی وضاحت چاہی تو خواجہ صاحب بولے "جو بات میرے ہم عصر کمرے کے اندر کرتے ہیں میں نے اس کا ذکر باہر کر دیا ہے۔" خوشامد کے کئی معانی اور مفاہیم ہیں۔ ایک شخص سمجھتا ہے کہ الف، ب کی خوشامد کر رہا تھا جبکہ ب کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ وہ الف کو چونا لگا رہا

تھا یا بے وقوف بنا رہا تھا۔ ہر دو استدلال اپنے اندر تھوڑا بہت وزن رکھتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص وزیر اعلیٰ کو یہ کہے کہ جناب کا انداز حکومت غلط ہے اور آپ کو انتظامی امور کا قطعاً تجربہ نہیں تو اسے آپ کیا کہیں گے؟ جرات رندانہ یا حرکت احمقانہ۔ اسی طرح اگر کوئی یہ کہہ دے کہ جناب بہت تھک گئے ہیں کہیں تو ذرا پاؤں دبا دوں۔ یقیناً وزیر اعلیٰ وہی لات اس کو دے مارے گا۔ خوشامد، کاسہ لیسی اور معاملہ فہمی میں بہت نازک فرق ہے۔ کسی کو شیشے میں اُتارنے کا فن ہر کسی کو نہیں آتا۔ انتظامی طور پر محروم اور مفلوج لوگ اپنی نااہلی کو چھپانے کے لئے اکثر ان باتوں کا سہارا لیتے ہیں۔ صاحب! چونکہ ہم لوگ خوشامد نہیں کرتے اس لئے ہمیں کوئی اچھی پوسٹنگ نہیں دیتا۔ اگر محض خوشامد کے زور پر کوئی شخص ترقی کے زینے پر چڑھ سکتا تو آج سارے بھانڈ، مراثی اور نقال چیف سیکرٹری اور ہوم سیکرٹری لگے ہوتے۔ جس طرح ایک اچھی خوشبو عطار کے لب بیچ دیتی ہے اور اپنا پتہ خود دیتی ہے اسی طرح ایک محنتی، متحرک اور ایماندار شخص زیادہ دیر تک گوشہ گمنامی میں نہیں ٹھہر سکتا۔ محنت کی اپنی خوشبو ہے۔ اس کی مخصوص مہک ہے۔ جس طرح عقیق سو بار کٹنے کے بعد نگین بنتا ہے اسی طرح محنت کی بھٹی میں تپ کر ہی لوگ کندن بنتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایک محنتی شخص کبھی کسی کا زیر بار نہیں ہوتا۔ شرمندہ احسان نہیں ہوتا۔ غالب نے کیا خوب کہا تھا:

دیوار بار منت مزدور سے خم
اے خانماں خراب نہ احساں اُٹھائیو!

.....

دیانت کے چشمے کسی کوہ قاف سے نہیں پھوٹتے۔ ان کا منبع ایک کوہ ندا ہے جو ہر وقت اور بروقت انسان کو اس کی لغزشوں، ناجوازیوں، کوتاہیوں اور کمزوریوں سے آگاہ کرتا ہے۔

صرف اس کوہ کے دامن میں میسر ہے نجات
آدمی ورنہ عناصر میں گھرا رہتا ہے

.....

ایمانداری ایک ایسا تکیہ ہے جس پر سر رکھ کر آدمی نہ صرف دن چین سے گزارتا ہے بلکہ رات کو بھی گھوڑے بیچ کر سوتا ہے۔ گلستان سعدی میں ایک حکایت ہے ایک بادشاہ نے اپنے وزیر کو بے وقوف لوگوں کی فہرست مرتب کرنے کے لئے کہا۔ صبح جب اس نے فہرست پیش کی تو سرفہرست ظل سبحانی کا نام تھا۔ اس پر بادشاہ بڑا جز بز ہوا۔ اس نے وزیر کو کہا تم نے میرا نام کیسے لکھ دیا ہے؟ وزیر دست بستہ ہو کر بولا ''حضور! جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔'' ان دنوں بھی وزیروں کے لئے جان کی امان طلب کرنا ضروری ہوتا ہے۔ نہیں تو ان کا حشر بھی اس ''وزیر باتدبیر'' کی طرح ہوتا تھا جس کا ذکر Thackary نے اپنی

پیروڈی سلطان سٹورک میں کیا ہے۔ وہ رقمطراز ہے:

Though almost all of his teeth had been knocked out, yet wisdom and persuation hung on his lips, though one of his eyes, in the fit of royal indignation had been closed for ever, yet no other eye in the entire universe was as keen as his remainingball.

خیر جب اسے اذنِ اماں ملی تو وہ بولا "کل ایک اجنبی ملک سے ایک اجنبی سوداگر آیا ہے۔ آپ نے ہزار گھوڑوں کی رقم اسے پیشگی ادا کر دی ہے کہ اگلے سال وہ آپ کے لئے گھوڑے خرید کر لائے۔ نہ آپ اس ملک کو جانتے ہیں اور نہ سوداگر کے کردار سے آشنا ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور حماقت کیا ہو سکتی ہے۔"

"بالفرض اگلے سال وہ گھوڑے لے آیا تو؟" بادشاہ نے پوچھا۔

"تو پھر میں عالم پناہ کا نام کاٹ کر اس کا لکھ دوں گا۔" وزیر برجستہ بولا۔

اس واقعہ سے کم از کم ایک بات تو ثابت ہوتی ہے کہ قرونِ اولیٰ اور قرونِ وسطیٰ میں بھی گھوڑوں کا کاروبار ہوتا تھا۔ اگر فرق پڑا ہے تو صرف اتنا کہ اب سوداگر ختم ہو گئے ہیں اور گھوڑوں نے خود اپنی قیمت لگانی شروع کر دی ہے۔ ہر چند کہ ملک غریب ہے لیکن ارباب حکومت امیر ہیں۔ شوق خریداری میں بسا اوقات تمیز نہیں برت سکتے اور اس طرح گدھے بھی گھوڑوں کے بھاؤ بک جاتے ہیں۔

رحیم یار خان: اسی تناظر میں جب میرا تبادلہ رحیم یار خان ہوا تو کئی جبینیں شکن آلود ہوئیں، کئی ماتھوں پر بل پڑے۔ سب سے زیادہ قلق ایم ایس چودھری چیف سیکرٹری کو تھا جس نے سزا کے طور پر مجھے او ایس ڈی لگایا تھا۔ وہ اتنے بڑے ضلع کی سربراہی کیسے سونپ سکتا تھا۔ پی سی ایس کیڈر سے قطع نظر بھی اُسے مجھ سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ جس دن جنرل جیلانی نے اس کو فون کر کے میری پوسٹنگ کا کہا اس دن سے ہی اس کے دل میں گرہیں پڑ گئی تھیں۔ ایک سوال کیا جا سکتا ہے کہ اتنے بڑے افسر کو اتنے چھوٹے افسر سے کیا پرخاش ہو سکتی تھی؟ تو اس کا سیدھا سادا جواب تو یہ ہے کہ یہی اس کا چھوٹا پن تھا اور اس کی واقعاتی شہادتیں بھی تھیں۔ بطور چیف کارپوریشن آفیسر مجھے اکثر میٹنگوں میں جانا پڑتا تھا۔ وہاں ایک تو اس کا رویہ معاندانہ ہوتا پھر اس قسم کے حکم صادر کرتا جس کی تعمیل اس قلیل مدت میں ممکن نہ ہوتی۔ وہ ایسی حرکات عمداً کرتا تھا۔ مقصد ماتحت کو زچ کرنا اور under

tension رکھنا ہوتا۔ مثلاً جب کسی سربراہ مملکت کی آمد ہونی ہوتی تو چند گھنٹوں کی قلیل مدت میں بیسیوں کام بغیر پیشگی نوٹس کے کہہ دیتا۔ اگر کوئی محکمانہ مجبوریوں کا ذکر کرتا تو وہ غرانا شروع کر دیتا۔ مجھے جب اس نے کارپوریشن سے ہٹایا تو اس وقت بھی اس کا استدلال کچھ اسی قسم کا تھا۔

امتیاز مسرور کو کہنے لگا "اس کے دماغ میں خود اعتمادی کا کیڑا گھسا ہوا ہے۔ His replies are always condescending اس قسم کا ماحول تو غالباً مغلوں کے دربار میں بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس قدر بے مروّت اور مغرور افسر میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔

رحیم یار خان پنجاب کا آخری ضلع ہے لیکن کئی وجوہ سے نہایت اہم ہے۔ اس کے جنوب میں سندھ کا بارڈر ہے۔ مشرق میں بیکانیر اور جیسلمیر کی ریاستیں ہیں اور صحرائے چولستان ہے۔ مغرب میں دریائے سندھ بہتا ہے۔ دریا سے نہر نکال کر اس کی زمینوں کو سیراب کیا گیا ہے۔ انگریزوں نے کمال مہارت سے ریلوے لائن ایسی جگہ بچھائی ہے جس کے بائیں طرف کھارا پانی ہے اور دائیں جانب میٹھے پانی کا زون شروع ہو جاتا ہے۔ بڑے شہروں میں آباد کار زیادہ ہیں جبکہ دیہاتی علاقوں میں ریاستی بستے ہیں۔ آباد کاری میں ۵۰ء کی دہائی میں تعینات ڈپٹی کمشنر مولوی اختر علی گجر کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس نے سارے پنجاب کے گجروں کو خود بلا کر وہاں زمینیں الاٹ کیں اور آباد کیا۔ ان میں اکثریت گجرات کے رہنے والوں کی تھی۔ اس کی دریا دلی کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی سائل ڈیرے پر روٹی مانگنے آتا تو اس کو بھی ساڑھے بارہ کلے زمین دے کر واپس بھیجتا۔ وقت ہی کچھ ایسا تھا۔ اس نے سگریٹ کی خالی ڈبیوں پر حکم نامے لکھ کر زمینیں الاٹ کیں۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ سیر کر رہا تھا تو کسی سائل نے زمین مانگی۔ اتفاقاً اس وقت کاغذ نہ تھا۔ مولوی صاحب نے کچھ سوچ کر اس کو کہا اپنا دایاں ہاتھ آگے کرو۔ جب اس نے ہاتھ کھولا تو مولوی صاحب نے اس پر ہی الاٹ منٹ آرڈر لکھ دیا۔ ان کی دیکھا دیکھی ارائیں برادری اور جاٹوں نے بھی ادھر کا رُخ کیا۔ یہ بڑے محنتی لوگ تھے۔ دن رات محنت کر کے انہوں نے زمینوں کو قابل کاشت بنایا۔ ریت کے ٹیلوں کو ہموار کیا اور موسموں کی سختیاں جھیلیں۔ سردار اسلم جلوانہ پراگریسیو فارمر تھا۔ وہ مولوی اختر علی کا داماد تھا۔ اس کے پاس تیس مربعے زمین تھی۔ سردار صاحب نے زمینوں میں بڑا خوبصورت فارم ہاؤس بنا رکھا تھا۔ وہ بتاتے تھے کہ ایک طویل عرصے تک وہ ریلوے اسٹیشن سے اپنی زمینوں تک اُونٹ پر سوار ہو کر پہنچتے تھے کیونکہ اس وقت پکی چھوڑ کچی سڑکیں بھی نہ بنی تھیں۔

رحیم یار خان ضلع کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ پنجاب کے ان معدودے چند اضلاع میں سے ایک ہے جہاں انتظامی قطع و برید یا تراش خراش نہیں ہوئی۔ پنجاب میں بہاولپور ڈویژن کو چھوڑ کر تقریباً ہر ضلعے کے حصے بخرے کر دئے گئے ہیں۔ ملتان ضلع سے بتدریج چار ضلعے نکالے گئے ہیں۔ یہی حال دوسرے اضلاع کا ہے۔

رحیم یار خان میں صحرا بھی ہیں اور مرغزار بھی۔ بہت بڑی زمینداریاں بھی ہیں اور نہایت چھوٹے کاشتکار محنت کر کے اجناس کی صورت میں زمینوں سے سونا اُگلواتے ہیں۔ کارخانوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ ایک ضلعے میں پانچ شوگر ملیں ہیں۔ لیور برادرز، فوجی فرٹیلائزر اور بے شمار ٹیکسٹائل ملز اور جننگ فیکٹریاں ہیں۔ اس کے علاوہ سیٹھ اسلم نے کوکا کولا اور سمباجوس کی فیکٹریاں لگا رکھی تھیں۔ پشاور سے کراچی جانے والی مرکزی سڑک یہاں سے گزرتی ہے جسے KLP روڈ کہا جاتا ہے۔ رقبے کے لحاظ سے بھی بہت بڑا ضلع ہے۔ اگر ہالینڈ اور اسرائیل کی ریاستوں کو یکجا کیا جائے تو ان کے برابر اس کا رقبہ ہے۔ ضلع چنی گوٹھ سے شروع ہو کر کوٹ سبزل پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ صادق آباد، خان پور، لیاقت پور اور رحیم یار خان اس کی تحصیلیں ہیں۔

رحیم یار خان جانے سے قبل میں نے وہاں کے ڈپٹی کمشنر ایوب مارتھ صاحب کو فون کر کے رسماً آنے کی اجازت چاہی۔ کہنے لگے ''جب جی چاہے آ جاؤ میں چارج دے دوں گا۔ اس کے بعد بھی میں نے چند دن کی عمداً تاخیر کی۔ اس پر دوست احباب نے ہلکا پھلکا احتجاج بھی کیا۔ ان کا خیال تھا کہ ایک دن کی تاخیر بھی بسا اوقات صورت حال کو یکسر بدل دیتی ہے۔ جس افسر کا اہم پوسٹ سے تبادلہ ہو وہ اسے رکوانے کے لئے ضرور ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ اس قسم کا تجربہ مجھے پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا لیکن پھر بھی جی نہیں چاہتا تھا کہ اپنے پیشرو کو مناسب وقت دئے بغیر وہاں پہنچ جاؤں۔

رحیم یار خان جانے سے پہلے میں بہاولپور جا کر کمشنر شیخ علی ذوالقرنین صاحب کو ملا۔ بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے ''میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ تمہیں تعینات کرانے میں میرا ہاتھ تھا لیکن میری دعائیں اور خواہشات ضرور شامل تھیں۔ تم کل جا کر چارج لے لو۔'' ایوب مارتھ شریف انسان ہے لیکن کچھ تھکا تھکا سا لگتا تھا۔ جٹ ہونے کے ناطے ضلع کے ارائیوں نے اس کے خلاف محاذ کھڑا کر رکھا تھا جن کا سرغنہ چیئرمین میونسپل کمیٹی میاں عبدالخالق تھا۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب دو چار تاریں یا شکایتیں نہ آتی ہوں۔ مارشل لا کی چھتری تھی اس لئے وہ کسی نہ کسی طور وقت گزار گیا ہے لیکن جمہوری حکومت میں شاید ایسا ممکن نہ ہوتا۔

[جاری ہے۔]

غزل

شام کا جادُو چل جائے گا
جبر کا سُورج ڈھل جائے گا

پیار کی شاخ نہ سُوکھنے پائے
دَرد کا پُھول تو پَھل جائے گا

پتّھر کھاتا ، سَر سہلاتا
نگر نگر پاگل جائے گا

مات بساط سے باہر ہو گی
چَال وہ ایسی چل جائے گا

ہمسفری کیا ، ہم نظری کیا
سانپ کو سانپ نگل جائے گا

بان پہ بان چلیں گے دِل پر
سودا سر سے ٹَل جائے گا

باپ کہاں کا؟ شہزادہ تھا
کھا کھا جُوٹھ وہ پَل جائے گا

چہرہ شعلہ ، لہجہ شعلہ
وہ خود آرا جل جائے گا

کھینچ کمانِ حیات نہ خالد
سانس کا تیر نکل جائے گا

خالد احمد

غزل

نئے دیے سرِ محفل جلا دیے ہم نے
مگر وہ یار پرانے بُھلا دیے ہم نے

تمھارے غم کی بدولت بہت ہوئے رسوا
کمال یہ ہے کہ دریا بہا دیے ہم نے

بہت خیال ہے اپنے سخن کی عظمت کا
کہے جو شعر وہ تم کو سُنا دیے ہم نے

غمِ فراق کا اس دم ہوا ہے اندازہ
جب اپنے صحن سے پنچھی اُڑا دیے ہم نے

مقابلے میں ہمیں ہار کب ہوئی جاناں
تمھارے سامنے پتے گرا دیے ہم نے

چمک رہے ہیں محبت کی خوش خطی کی طرح
تجھے جو گال پہ تحفے سدا دیے ہم نے

جو کھیل کھیلے ہیں ثاقبؔ وہ سب مہارت ہے
تری طرح کے کھلاڑی ہرا دیے ہم نے

آصف ثاقب

غزل

رہ کوئی نکالی بھی تو کیا اپنا ہنر ہے
تقدیر سے تقدیر کی جانب ہی سفر ہے

سب رنج و مصائب کا سبب اپنی خطائیں
ہر راحتِ جاں تاب کا سہرا ترے سر ہے

توڑا ہے زمانے کے حصاروں کو کئی بار
پر ذات کے غاروں سے کہاں ہم کو مفر ہے

پہچان ستارے تو گئے ہاتھ سے سارے
اک خواب سہارا بھی نہ چھن جائے یہ ڈر ہے

تاراج کیے اُس نے جنوں خیز حوالے
اب سوچ اجالوں کی طرف اس کی نظر ہے

اک سمت محبت ہے اور اک سمت ہے شہرت
مچلا ہوا دل اُس کا اِدھر ہے نہ اُدھر ہے

بے وجہ ڈراتا نہیں اوروں کو شب و روز
کہتا پھرے کچھ خوف نہیں اُس کو، مگر ہے

کرتا ہے وہ تردید مری میری لغت میں
عالی یہ مری طرزِ فغاں ہی کا اثر ہے

جلیل عالی

غزل

سُنی نہ اُس نے کبھی شہرِ مبتلا کی کتھا
سنائے جاتا ہے اک کھوکھلی رجا کی کتھا

کسی کی وحشتِ دل میں گنوا گیا کوئی جاں
الگ دیے کی کہانی ، جدا ہوا کی کتھا

پسِ حجابِ عبارت بھی غور سے دیکھیں
کہ اور بھی کوئی ہوتی ہے ہر کتھا کی کتھا

کیے ہوئے ہیں ہمیں اپنی منطقوں کا اسیر
مجھے ضمیر کا قصہ، اُسے انا کی کتھا

الم نصیب ہوئے دردِ مشترک میں قریب
تھی منفرد بھی ہر اک فردِ بے نوا کی کتھا

درونِ ذات بھی میں حالتِ جہاد میں ہوں
ترے لیے ہے فسانہ مری وفا کی کتھا

ترے فسونِ بیاں سے فلک نشاں ٹھہری
سنی سنائی ہوئی تھی جو بارہا کی کتھا

پڑھو کہ وادیِ کشمیر کے نہتوں نے
لکھی لہو سے نئی ایک کربلا کی کتھا

تراشتا ہے فسانے وہ نت نئے عالی
چھپائے چھپتی کہاں ہے مگر جفا کی کتھا

جلیل عالی

غزل

نہ دن خوش آتا ہے، نے رات راس آتی ہے
کہاں یہ صورتِ حالات راس آتی ہے

جو بات سُننے کا امکاں نظر نہیں آتا
ہمارے دل کو وہی بات راس آتی ہے

وہ جس سے اپنی ملاقات ہو نہیں سکتی
ہمیں اُسی سے ملاقات راس آتی ہے

جو اک جھلک سے یہ منظر بدل بھی سکتی ہے
وہ ایک جانِ کرامات راس آتی ہے

ترے جہانِ خرابی میں ، تیرے بندوں کو
بس ایک شامِ خرابات راس آتی ہے

میں جانتا ہوں ، خزاں فصلِ گل کا وقفہ ہے
مجھے بہار کی ہر بات راس آتی ہے

الم نصیب فضاؤں کے زرد موسم میں
بہت دنوں میں کوئی بات راس آتی ہے

وہ جو نوشتۂ دیوار پڑھ نہیں سکتے
اُنہی کو مرگِ مفاجات راس آتی ہے

جو صبحِ نو کے اُجالوں سے خوف کھاتے ہیں
اُنھیں فقط شبِ ظلمات راس آتی ہے

جمیل یوسف

غزل

چاہا ہے اسے میں نے محبت کے سوا بھی
کچھ اس سے تعلق ہے رفاقت کے سوا بھی

اک روح کوئی اور بھی ہے اس میں الگ سے
رکھتی ہے نظر مجھ پہ عنایت کے سوا بھی

تقسیم وہ کرتی ہے مجھے سود و زیاں میں
میں اس کو میسر ہوں ضرورت کے سوا بھی

اے کاش! اکیلے میں گنائے وہ مرے عیب
تصویر بنائے مری صورت کے سوا بھی

ہوتا ہی نہیں میں کبھی اس آنکھ سے اوجھل
رہتا ہوں عقوبت میں عقوبت کے سوا بھی

چہرے سے ہٹا اپنے تفکر کی علامت
کچھ دیکھ مری آنکھ میں حیرت کے سوا بھی

وہ مجھ کو جلا دیتی ہے ٹھنڈک کی لپٹ سے
اس پاس ہے کچھ جسم کی حدت کے سوا بھی

سو کام سکھاتا ہے ہمیں اس کا تعاقب
ہوتے ہیں کئی شغل مسافت کے سوا بھی

اب خود سے جھگڑنا ہمیں پڑ جاتا ہے محسن
کچھ فیصلے ہوتے ہیں عدالت کے سوا بھی

محسن اسرار

غزل [نذرِ جناب خورشید رضوی]

عیاں سے آنکھ ہٹا کر نہاں کو دیکھ لیا
تو ایک ذرّے میں ہم نے جہاں کو دیکھ لیا

کسی نے جب مرے قلبِ تپاں کو دیکھ لیا
گماں کرے گا کہ آتش فشاں کو دیکھ لیا

نہیں ہے شوق ہمیں جا کے اُس کو چھونے کا
ہمیں یہی ہے بہت، آسماں کو دیکھ لیا!

درونِ ذات جونہی اِک نگاہ کی ہم نے
''وجودِ سنگِ رہِ درمیاں کو دیکھ لیا''

ظفرؔ(۱) کو دیکھ کے ایسا لگا کہ بارِ دِگر
جنابِ میرؔ سے جادو بیاں کو دیکھ لیا

یہ معجزہ بھی دِکھایا ہے چشمِ بینا نے
کہ ہم نے گُل میں چھپے گلستاں کو دیکھ لیا

پکارا مَیں نے اُنھیں جب تو آسمانوں نے
بس اِک نظر سے مرے خاکداں کو دیکھ لیا

جو ہم نے دیکھا سرِ رہگذارِ آیندہ
اِک اَور قافلۂ رفتگاں کو دیکھ لیا

وُہ ایک عُمر رہا تھا مکیں مرے دِل میں
پھر اُس کی یاد نے خالی مکاں کو دیکھ لیا

ہماری ذات کے پھیلاؤ کا کرشمہ ہے
مکاں میں رہتے ہوئے لامکاں کو دیکھ لیا

شکستگی کے مراحل میں جو ستارہ تھا
مری نظر نے وہیں کہکشاں کو دیکھ لیا

پھر اس کے بعد کہاں کی اڑان، کیسا سفر!
اگر پرندے نے آبِ رواں کو دیکھ لیا

خیال تھا کہ یہ دستک ہے موسمِ گل کی
مگر کواڑ جو کھولے، خزاں کو دیکھ لیا

کچھ اور روز و شبِ زندگی ہوئے جو عطا
کچھ اور گردشِ سیّارگاں کو دیکھ لیا

اُسے تو کرنا ہی تھا پورے زور سے حملہ
عدو نے جب مری ٹوٹی کماں کو دیکھ لیا

وہ جس نے دیکھی نہیں ڈوبتی ہوئی کشتی
ہوا میں اُڑتے ہوئے بادباں کو دیکھ لیا

نسیمِ سحر

(۱) اس شعر میں ظفر سے مراد ہندوستان کے شاعر ظفر مہدی مرحوم ہیں جو جدہ مقیم تھے اور جنہیں ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب سے بڑی عقیدت تھی)

غزل

جانے کس سمت کوئی بابِ سفر کھولتا ہے
سانس اکھڑتی ہے نہ اس رہ پہ قدم ڈولتا ہے

ایک ہی وقت میں آنکھوں سے بدن سے لب سے
اک وہی شخص محبت کی زباں بولتا ہے

پھول کھل اٹھتے ہیں گلدان میں مرجھائے ہوئے
لمس پوروں کا تحیّر کی گرہ کھولتا ہے

پاؤں رکھتا ہے زمیں پر تو زمیں جھومتی ہے
سانس لیتا ہے کہ وہ بادِ صبا جھولتا ہے

اس کی خوشبو سے مہک اٹھتی ہے کمرے کی فضا
پھول کھلتا ہے کہ وہ بندِ قبا کھولتا ہے

جانچ لیتی ہے وفا نرم نگاہی اس کی
وہ اسی باٹ سے ہر شے کا بھرم تولتا ہے

ایک تو اردو زباں، اُس پہ وہ لہجے کی کھنک
دیر تک بولنے دیتا ہوں اگر بولتا ہے

ڈھب سے چلنا ہے ترے شہر کی گلیوں میں مجھے
روک لیتا ہوں قدم پاؤں جہاں ڈولتا ہے

لفظ بھی شہد سے میٹھے ہیں کنور، اور ان کے
ایک اک حرف میں شیرینیٔ لب گھولتا ہے

اعجاز کنور راجہ

غزل

آئے وہ دن کہ اس کی گلی سے گزر بھی ہو
لیکن حصارِ غم سے نکلنے کو در بھی ہو

اب اعتبارِ دیدۂ بے خواب اُٹھ گیا
سمٹے سیاہ رات تو شاید سحر بھی ہو

منظر تو جاں فزا ہے نگاہوں کے سامنے
اس قافلے میں صبح کے عزمِ سفر بھی ہو

ممکن کہاں قیام کی صورت کہ رہ سکیں
اس قریۂ شباب میں رہنے کو گھر بھی ہو

الفت میں تھا خلوص کی دولت پہ انحصار
اب آدمی کے پاس مگر مال و زر بھی ہو

احوال کیا بتایئے اوروں کا بے خبر
اس پیش گو غریب کو اپنی خبر بھی ہو

کٹتے ہیں روز و شب اسی اُمید پر حسنؔ
وہ چشمِ التفات کہ شاید ادھر بھی ہو

حسن عسکری کاظمی

غزل

رنگِ حنا پہ رنگِ خزانی نہیں چڑھا
دریا اُتر گیا ہے کہ پانی نہیں چڑھا

کٹتے ہیں بے کنار اندھیرے میں رات دن
دیوار پر چراغِ زمانی نہیں چڑھا

سویا رہا ہوں کتنے زمانوں تلک کہ میں
بوڑھا تو ہو گیا ہوں، جوانی نہیں چڑھا

آنکھوں میں سرفراز ہے اک آئنہ بدن
دل پر جمال پرتوِ ثانی نہیں چڑھا

لکنت زدہ تھی نطق کی تعبیر اس لیے
سر کو خُمارِ شعلہ فشانی نہیں چڑھا

تفہیم اس کنایۂ ہستی کی قرض ہے
دریائے صحِ حرفِ معانی نہیں چڑھا

لایا ہے میرا عشق مجھے اس مقام پر
میں بھی بزورِ شیریں بیانی نہیں چڑھا

ساجد زوالِ آدمِ خاکی نظر میں رکھ
چلّے میں کوئی یاد پُرانی نہیں چڑھا

غلام حسین ساجد

غزل

پانی ہے ، تو دریا ہے
سوکھ گیا تو صحرا ہے

اس کا نام محبت ہے
اُس نے پلٹ کر دیکھا ہے

اُس کے بدن کی خوشبو ہے
سارا کمرہ مہکا ہے

یہ آنا ، کیا آنا ہے،
بادل وہ ، جو برسا ہے

پیچھے میرے ، ٹریفک جام
آگے سڑک پہ دھرنا ہے

اہلِ تکاثر سے کہہ دو
عزّت ہی سرمایہ ہے

پہلے وعدہ کرنا ہے
اگلا کام مُکرنا ہے

بربادی کے قصّے میں
کِس کا کتنا حصہ ہے

اُس نے خط میں جانِ انیس!
اپنا نام ہی لکھا ہے

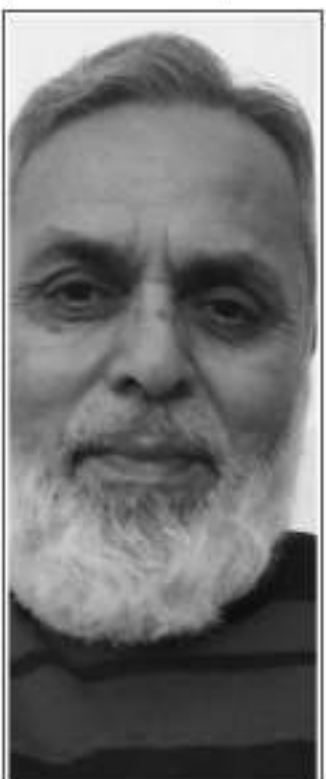

محمد انیس انصاری

غزلیں

جو ہے کارِ جہاں وہ حسبِ وعدہ کر لیا جائے
پھر اُس کے بعد چلنے کا ارادہ کر لیا جائے

کہیں ہو گی دلِ نامہرباں تیری تسلی بھی ؟
ہوس کا دائرہ کتنا زیادہ کر لیا جائے ؟

کسی رنگیں طبیعت سے جو دل کی بات کہنی ہے
سو اپنا ترجماں اِک حرفِ سادہ کر لیا جائے

ستاروں کی ضرورت پڑ گئی تاریکیٔ شب میں
تو اپنے آنسوؤں سے استفادہ کر لیا جائے

حضوری کی گھڑی ہے، خاکساروں سے ذرا کہنا
لحد کی خاک کو اپنا لبادہ کر لیا جائے

خاور اعجاز

جنت میں بھی ملے گا ثمر اِس زمین کا
لے جائیں گے وہاں بھی شجر اِس زمین کا

ہو گا جدھر کو جلوۂ عکسِ جمالِ یار
منہ پھیر دیں گے ہم بھی اُدھر اِس زمین کا

سمجھے تھے سیرِ باغِ جناں کی طرح مگر
مہنگا پڑا ہمیں تو سفر اِس زمین کا

دونوں کے دم سے کوچۂ ہستی میں رونقیں
خیر آسمان کا ہو کہ شر اِس زمین کا

نقشِ قدم پڑے ہیں مرے جب سے عرش پر
ہونے لگا فلک سے گذر اِس زمین کا

غزل

اک ایسا فیصلہ صادر ہوا حویلی میں
تڑخ گئی مری ریکھا تری ہتھیلی میں

بچھڑتے وقت کوئی بات کی تو تھی تم نے
مگر یہ دکھ ہے کہ وہ بات تھی پہیلی میں

میں رو رہا تھا ترا حالِ زار سنتے ہوئے
بلا کا صبر تھا لیکن تری سہیلی میں

بس ایک بار ہی تو نے چھوا تھا شاخوں کو
پھر اس کے بعد عجب تھی مہک چنبیلی میں

شباب اترتا ہے یکساں ہر ایک آنگن میں
وہ فرق ہی نہیں رکھتا سگی ، سوتیلی میں

حسن ، یقیں ہے اسے عمر بھر نہ آئیں گے
وہ رنگ ڈھنگ جو ہوتے ہیں کھائی کھیلی میں

حسن عباس رضا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کب یہ دیوارِ بے رُخی نہ رہے
کیا خبر کب وہ اجنبی نہ رہے

غزل

گلزار بخاری

اُس پہ الزام بھی دھرتے ہو یہ کیا کرتے ہو
پھر اُسی شخص پہ مرتے ہو یہ کیا کرتے ہو

پہلے افسانہ گری کرتے ہو شہرت کے لیے
ہو کے شرمندہ مکرتے ہو یہ کیا کرتے ہو

جس پہ رسوائی کا امکان بہت ہوتا ہے
اُسی رستے سے گزرتے ہو یہ کیا کرتے ہو

جانتے بھی ہو اُسی نے تمہیں برباد کیا
دم ستم گار کا بھرتے ہو یہ کیا کرتے ہو

آخرِکار کہیں خاک بسر ہونا ہے
اتنے بنتے ہو سنورتے ہو کیا کرتے ہو

ڈال دیتے ہو سفینے کو بھنور میں خود ہی
پار کم کم ہی اترتے ہو یہ کیا کرتے ہو

لب پہ ہیں عشقِ براہیم کی باتیں گلزارؔ
نارِ نمرود سے ڈرتے ہو یہ کیا کرتے ہو

غزل

اِدھر اُدھر کی مثالوں میں ایک مَیں بھی سہی
ترے عجیب سوالوں میں ایک مَیں بھی سہی

کشودہ کار بہ پیرایۂ جمال ہے کون
خراب و خستہ مقالوں میں ایک مَیں بھی سہی

بہت سے لوگ ہمیں چھوڑ کر روانہ ہوئے
سو اتنے چھوڑنے والوں میں ایک مَیں بھی سہی

لہو جگر کا ہے، آنکھوں سے بہنے والا ہے
چلیں، چھلکتے پیالوں میں ایک مَیں بھی سہی

کل اُس نگر میں تھا آزردگانِ دل کا ہجوم
تو آج اُن کے حوالوں میں ایک مَیں بھی سہی

خدا کا شکر کہ اک برق پاش رات کٹی
سو اب نحیف اُجالوں میں ایک مَیں بھی سہی

وہ سوچتا ہے تو اپنے لیے ہی سوچتا ہے
سو خالد اپنے خیالوں میں ایک مَیں بھی سہی

خالد علیم

غزل

سُن کے جھنکار سی صدا پتھر
بات کرتے ہیں بارہا پتھر

کیسی بہتی ہوئی کہانی تھی!
ایک کردار ہو گیا پتھر

جانے کس قیس کی تلاش میں ہے!
یہ خلاؤں میں گھومتا پتھر

دل بھی اک سنگ ہے دھڑکتا ہُوا
ذہن بھی ایک سوچتا پتھر

دستِ آئینہ گر چمک اٹھا
ایک پتھر مگر رہا پتھر

پھر سے قسمت مری اُٹھا لائے
لایئے کوئی دوسرا پتھر

ہم نے کیا کیا نہ ان کو زخم دیے
پھر بھی دیتے رہے دعا پتھر

عکس کس سنگ دل کا ابھرا تھا
آئنہ پھر سے ہو گیا پتھر

ایک پتھر تھا ، ایک دل ، حامدؔ!
میں نے بے ساختہ چُنا پتھر

حامد یزدانی

غزل

وسعتوں کی فکر کیوں کون و مکاں ہوتے ہوئے
کس لیے پر بستہ ہم ہیں کہکشاں ہوتے ہوئے

دید اور نادید کا الزام آنکھوں پر ہو کیوں
آسماں گر کچھ نہیں ہے آسماں ہوتے ہوئے

ہر شجر ہر شاخ پر گر آشیاں بنتا رہا
بجلیاں گرتی رہیں گی آشیاں ہوتے ہوئے

کوئی تو ساحل پہ ان کا منتظر ہوگا ضرور
کشتیاں جب ڈوبتی ہیں بادباں ہوتے ہوئے

ایسا لگتا ہے زباں کٹنے کا ڈر لوگوں کو ہے
وہ اگر خاموش ہیں منہ میں زباں ہوتے ہوئے

جن کے دم سے گرم رہتی تھی ہر اک محفل انھیں
دیر لگتی کچھ تو زیبِ داستاں ہوتے ہوئے

گر درخشاں نقشِ پا ہیں رفتگاں شوق کے
کس کو راہی ڈھونڈتا ہے کارواں ہوتے ہوئے

سید نواب حیدر نقوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

برے دنوں کے دکھی ساعتوں کے ساتھی ہیں
یہ لوگ بھی مرے غارت گروں کے ساتھی ہیں!

غزل

اظہار محال ہو گیا ہے
احساس وبال ہو گیا ہے

اب کچھ تو جواب دے زمانہ
ہر چہرہ سوال ہو گیا ہے

دل کی ہے اُڑان اب بھی جاری
گو بے پر و بال ہو گیا ہے

خوشیوں کو تلاش کرتے کرتے
دل وقفِ ملال ہو گیا ہے

ہر ایک جھپٹ رہا ہے جیسے
سُکھ لُوٹ کا مال ہو گیا ہے

میرے تری آنکھ میں ہیں آنسو
اے دوست! کمال ہو گیا ہے

محجوب نگاہ ہو گئی ہے
مستور جمال ہو گیا ہے

وارث کو تو خوں بہا ملا کچھ
خوں میرا حلال ہو گیا ہے

آزاد ہے روح قیدِ غم سے
جس دن سے وصال ہو گیا ہے

میرا دلِ زار؟ خیر چھوڑو
بس یوں ہی نڈھال ہو گیا ہے

صیاد کا خوف کس لیے ہو
جب باغ ہی جال ہو گیا ہے

تنگ آ کے علاج سے مسیحا
مصروفِ قتال ہو گیا ہے

الفاظ کے پیرہن میں آ کر
مجروح خیال ہو گیا ہے

مستقبلِ زیست کے لیے کیوں
ابتر مرا حال ہو گیا ہے

اپنے ہی خلاف دی گواہی
کیا تجھ کو جلال ہو گیا ہے

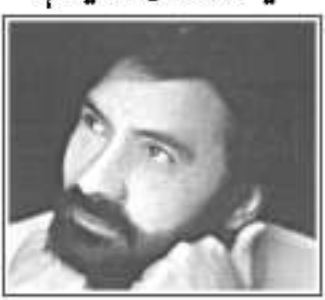

سید قاسم جلال

غزل

رشید آفرین

قدم قدم سے پیامِ نجات ملتا ہے
ہمارے رُخ سے رُخِ واقعات ملتا ہے

وہی ہوئے ہیں امینِ غمِ محبت بھی
وہ لوگ جن کو غمِ کائنات ملتا ہے

عبث تلاشِ سکونِ حیات ہے لوگو!
"حیات کھو کے سکونِ حیات ملتا ہے"

نہ ہو سکا ہے مرا کوئی بھی شریکِ سفر
مجھے تو سایا ہی بس اپنے ساتھ ملتا ہے

کریں جہاں میں جو تحقیق خونِ ناحق کی
تو آدمی ہی پسِ واردات ملتا ہے

ذرا گزر تو سہی بے ثبات عالم سے
اِسی کے بعد مقامِ ثبات ملتا ہے

ہمیں تو مل نہ سکا آفریں زمانے میں
سنا ہے دہر میں لطفِ حیات ملتا ہے

غزل

منظرِ کنجِ رفتگاں مِرا دل
اِک بہت قیمتی مکاں مِرا دل

جنگ تھی تیری اور میری مگر
آگیا کیسے درمیاں مِرا دل

موسمِ رایگاں دِکھاتا رہا
تھا چراغِ رہِ خزاں مِرا دل

توڑ دینا مزاجِ یار میں تھا
مسلکِ آئنہ گراں مِرا دل

روشنی ہر طرف بکھر رہی تھی
جا رہا تھا جہاں جہاں مِرا دل

ایک کوزے کی طرح تیرا جہاں
اور اِک بحرِ بیکراں مِرا دل

مٹنے والی ہے جو بھی شے ہے یہاں
جاوداں صرف جاوداں مِرا دل

ریاض رومانی

غزل

وفورِ گریہ سے بہتر خوشی نہیں کوئی
ہمیں ملی بھی تو بڑھ کر ملی نہیں کوئی

غمی خوشی میں جو آنسو کلام کرتے ہیں
زبان ایسی مؤثر بنی نہیں کوئی

خوشی غمی کو ثور رنگوں سے نسبتیں مت دے
سفید اور سیہ میں چھپی نہیں کوئی

بدن کے زخموں سے بڑھ کر تو دل پہ چرکے ہیں
نشاط خیز اذیت بچی نہیں کوئی

نوائے درد کی تانیں بھی ہچکیوں سی ہیں
چھوئی لبوں سے مگر بانسری نہیں کوئی

بدن کے چیتھڑے پہنے ہوئے ہیں روحوں نے
لباسِ فاخرہ میں دلکشی نہیں کوئی

تڑپ تڑپ کے اکیلے میں جان دینی ہے
یہ طے شدہ ہے تو پھر خوف ہی نہیں کوئی

شعاعِ رنج نے خورشید راکھ کر ڈالا
غمِ حسین کی آیت پڑھی نہیں کوئی

ہمارے پاس بھی کہنے کو داستانیں تھیں
کسی نے پاس بٹھا کر سنی نہیں کوئی

لکھا وہی ہے جو بیتا ہے جان پر اصغر
کہانی پاس سے گھڑ کر لکھی نہیں کوئی

علی اصغر عباس

غزلیں

جو ہم نے حجرۂ خوباں میں اعتکاف کیا
جنونِ عشق نے وحشت کا اعتراف کیا

چھپی ہے دل میں جو خوشبو خمارِ ساغر ہے
بنائے عشق کا رندوں نے انکشاف کیا

جنوں کی حد سے جو بچھڑے تو پھر نہ مل پائے
جدائی نے مرے دل میں عجب شگاف کیا

یہ کیسا آئنے میں کھیل جاری ہے سیّد
کہ عکسِ یار نے ہونے کا انحراف کیا

سید مقبول حسین

یہ سچ ہے اب کوئی ہمدم نہیں ہے
وہ کافر بھی ترا محرم نہیں ہے

ترے ہونے سے میرا دل ہے خنداں
جہاں تو ہے کوئی بھی غم نہیں ہے

محبت کے سبھی موسم ادھورے
محبت کا کوئی موسم نہیں ہے

مری خواہش ہے تیرے ساتھ جی لوں
شباب جاں بھی تو محکم نہیں ہے

کشودِ پیرہن سیّد نہ پوچھو
بھلا کیا کچھ یہاں برہم نہیں ہے

غزل

کب سے قبلہ رو بیٹھے ہیں حرفِ دعا اور میں
خاموشی کے ساتھ ہیں دونوں، میرا خدا اور میں

ریت کی لہروں سے ہر لمحہ باتیں کرتے ہیں
دونوں دشت کے باسی نکلے سناٹا اور میں

انسانوں نے خواب زمیں کو بنجر کر ڈالا
چھپ چھپ کر روتے رہتے ہیں یہ دنیا اور میں

کب تک تیری یاد جنوں کا ساتھ نبھائے گی
کب تک آخر ساتھ رہیں گے ایک صدا اور میں

برسوں سے بس اک دوجے کے ساتھ سفر میں ہیں
جس رستے پر تم بچھڑے تھے وہ رستا اور میں

اپنی اپنی تقدیروں پر سب رنجیدہ ہیں
شبنم، آنسو، رات، ستارے، خواب، گھٹا اور میں

رخسانہ صبا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ بھید کھلا معرفتِ شام و سحر سے
دن، شب سے جدا ہے نہ الگ عیب، ہنر سے

غزل

کہیں مٹایا گیا تو کہیں بنایا گیا
میں اُتنا یاد رہا جس قدر بھلایا گیا

تری تلاش میں چھانی ہے کائنات تمام
میں اپنی ذات کے اندر بھی کتنا آیا گیا

کوئی زمیں نہیں نا سازگار عشق یہاں
یہ پھول وہ ہے جو آنکھوں میں بھی کھلایا گیا

بفیضِ پائے تخیل، بزورِ فکرِ رسا
جہاں میں تھا ہی نہیں، اس جگہ بھی پایا گیا

کچھ آفتاب صفت لفظ میری پشت پہ ہیں
سو آنے والے دنوں میں بھی میرا سایہ گیا

ہمارے لفظ سے معنی تلک جو حائل تھا
نظر اٹھی تو وہ برجِ بلند پایہ گیا

نہ مل سکی کبھی استھائی انترے کے گلے
ہزار بار اگرچہ میں گنگنایا گیا

حیات خواب کی صورت گزر گئی اپنی
بدستِ مرگ ہمیں نیند سے جگایا گیا

رحمان حفیظ

غزلیں

بظاہر اور ہی کچھ تھا رُخِ انوار کا موسم
نظر کو کر گیا حیراں پسِ دیوار کا موسم

چراغِ طُور بن کر یہ ترے افکار چمکیں گے
کبھی تو یاد آئے گا ترے کردار کا موسم

کبھی روٹی، کبھی چادر، کبھی گرداب ہستی میں
بڑا ہی تلخ ہوتا ہے یہاں فنکار کا موسم

غموں کی دُھوپ، ظلمت، بے نوا یادوں کی تنہائی
بڑی مُدّت تلک ٹھہرا ترے انکار کا موسم

یہی اِک فلسفہ اقبالؒ کا، اقبال نے سمجھا
خزاں کی زد پہ رہتا ہے ہمیشہ پیار کا موسم

اقبال سروبہ

محبت کے حسیں نغمے سنانے کون آئے گا
ستاروں سے تری محفل سجانے کون آئے گا

اُٹھیں اور اِس زمانے کی روایت کو بدل ڈالیں
ہمارے بعد دیواریں گرانے کون آئے گا

مری صورت گلوں کی آس لے کر بھولے بھٹکے سے
پھر اِس پُر خار وادی میں نجانے کون آئے گا

بھلا دے شوق سے مجھ کو مگر یہ ذہن میں رکھنا
دیا تیری محبت کا جلانے کون آئے گا

سجا کے سر ہتھیلی پر زمانے بھر کو دِکھلایا
وفا اقبال کی صورت نبھانے کون آئے گا

غزل

ہماری نسل کُشی قتل کرنے والی ہے
نفاذِ عرصۂ ماقبل کرنے والی ہے

سجا کے رکھے گی زندان میں مجھے خلقت
یہ مجھ سے آج عجب عدل کرنے والی ہے

یہ اور بات خطا کار ہیں ترے بندے
پہ تیری ذات بڑا فضل کرنے والی ہے

تو کیا یہ جھوک سکوں امن کا نشاں ہو گی؟
تو کیا یہ راج سبھا عدل کرنے والی ہے؟

کوئی بھی کام انوکھا بھلا کرے کیسے ؟
یہ ساری خلق تو بس نقل کرنے والی ہے

ہجومِ عشق و محبت کی کھینچا تانی اب
ہر ایک شکل کو بے شکل کرنے والی ہے

جنوں دکھاتا پھرے لاکھ معجزے فرحتؔ
مگر وہ معرکے جو عقل کرنے والی ہے!

فرحت عباس

غزل

گھر گھر رہتی ہے یہ بات
کب تک سُدھریں گے حالات

وائرس میں اتنی اموات
توبہ توبہ ہے ، ھَیہات

کیا ہو گا انجام آخر؟
سوچتے رہتے ہیں دن رات

ابرِ اَلم چھٹ جانے دو
پھر سے گونجیں گے نغمات

رُسوائی سے بچنے کو
گھر میں رکھیے گھر کی بات

پیڑ لگاؤ ، مت سوچو
کون سمیٹے گا ثمرات

کھا جائیں گے تَن مَن دھن
بڑھتے ہوئے یہ اخراجات

اُن کے دعوے ہیں جھوٹے
بے بنیاد ہیں الزامات

آپ ریاست کے والی
آپ کے آگے ہم حشرات

کم ہے کتاب راشد سے
جوش کی ''یادوں کی بارات''

ممتاز راشد لاہوری

غزل

ایسا ممکن تھا کوئی معجزہ ظاہر ہوتا
یار لازم تو نہیں ہم سے وہی پھر ہوتا

اب تلک بھول چکا ہوتا میں کب کا تم کو
میں اگر تم کو بھلا دینے پہ قادر ہوتا

میں غزل کہتا، تو رک جاتا زمانہ سننے
لفظ تصویریں بنا دیتا ، جو شاعر ہوتا

دن اگر تیری معیت میں گزارے ہوتے
سب کو انگلی پہ نچا لینے میں ماہر ہوتا

روشنی پھوٹتی ، تصویریں بناتا ایسی
رنگ خوشبوؤں میں ڈھلتے ، جو مصور ہوتا

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ظاہر نہ کسی کور نظر پر بھی ہُوا میں
کیا فرق پڑا، تجھ پہ کُھلا ، یا، نہ کُھلا میں

غزل

گو دسترس میں اُس کی زمان و مکان تھے
لیکن ہوا کا خواب کھلے بادبان تھے

وہ دو قدم بھی ساتھ ہمارے نہ چل سکا
دریا پہ دوستو ہمیں کیا کیا گمان تھے

تاروں کی کشتیوں میں رواں ہو گئے کہیں
وہ خواب جو ہوائے شبِ غم کی جان تھے

زخموں کی آرزو میں پڑے رہ گئے کہیں
وہ تیر اور تھے جو ابھی بے کمان تھے

دشمن سے جا ملے تو کھلے ان کے رنگ ڈھنگ
وہ لوگ جو کہ شہرِ محبت کی شان تھے

لفظوں تک آ کے سارے زمانے پہ کھل گئے
موجِ صدا کے دل میں جو غم کے نشان تھے

دستِ صبا سے اُن پہ درِ زندگی کھلا
ورنہ تو رزقِ خاک چمن زادگان تھے

خورشید ربانی

غزل

نہ کچھ تدبیر ہے باقی نہ کچھ تسخیر کرنے کو
ہے اک منظر مرے آگے نظر تصویر کرنے کو

ابھی تو وقت کی انگڑائی بھی ٹوٹی نہیں یارو
ابھی سے ڈھونڈتے ہو راستے تاخیر کرنے کو

الگ کیوں اہلِ دنیا سے سجا کے خواب بیٹھے ہو
کہ دنیا لازمی ہے خواب کی تعبیر کرنے کو

گدازِ دل بھی ہو شامل تو ہو احساس بھی زندہ
فقط اینٹیں نہیں ہوتی ہیں گھر تعمیر کرنے کو

یہ سب کہتے ہیں باتوں سے کہاں حالات بدلے ہیں
سبھی کہتے تو ہیں لیکن فقط تقریر کرنے کو

روایت ہی کا تو اک جبر ہیں یہ نیکیاں اپنی
وگرنہ دل مچلتا رہتا ہے تقصیر کرنے کو

گِلے سب مٹ گئے روشن یوں بے توقیر رہنے کے
کہ اب باقی نہیں کچھ بھی یہاں توقیر کرنے کو

اعجاز روشن

غزل

سایہ ، برگد کا گھنیرا نہیں ہونے دیتے
میرے ڈیرے کو وہ ڈیرا نہیں ہونے دیتے

چند پروردۂ شب ، آج بھی ہیں دنیا میں
جو کسی طور ، سویرا نہیں ہونے دیتے

شام ہوتے ہی تری یاد کے جگنو ، اکثر
قریۂ دل میں اندھیرا نہیں ہونے دیتے

وہ تو شامل ہے مری روح کی گہرائی میں
اہلِ دنیا ، جسے میرا نہیں ہونے دیتا

شہرِ جاناں میں گزارے ہوئے لمحے ، شوکت
شہرِ دیگر میں بسیرا نہیں ہونے دیتے

شوکت محمود شوکت

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر قدم تجھ سے نئی دوری کا غم پائیں گے ہم
حادثوں کی سیڑھیاں چڑھتے چلے جائیں گے ہم

غزلیں

حوصلہ سامان میں رکھا ہوا ہے
اشک بھی امکان میں رکھا ہوا ہے
دیپ طاقوں میں جلائے جا چکے ہیں
آندھیوں کو دھیان میں رکھا ہوا ہے
چاندنی رکھی ہوئی ہے گھر کے اندر
دھوپ کو دالان میں رکھا ہوا ہے
اک جہاں وہ ہے جسے سب دیکھتے ہیں
اک تری مسکان میں رکھا ہوا ہے
کرتا رہتا ہوں خدا سے بات اکثر
دل کو اطمینان میں رکھا ہوا ہے

سعید راجہ

مدارِ عشق میں آ کر کلام کرنے لگا
ازل سے چپ تھا جو فر فر کلام کرنے لگا
تمام ہونے لگی تھی سماعتوں کی طلب
پھر ایک روز وہ پتھر کلام کرنے لگا
ہمارے شہر میں قدغن تھی بات کرنے پر
میں اپنے آپ سے چھپ کر کلام کرنے لگا
مری زبان کو لکنت نے آ لیا تھا مگر
وہ ہنس پڑا تو میں بہتر کلام کرنے لگا
درونِ چشم ذرا سی تری جھلک اُتری
مری نگاہ سے منظر کلام کرنے لگا

لاؤ کوئی شے جو ہو اس کے برابر
درد کو میزان میں رکھا ہوا ہے
رقص میں ہیں ریشمی یادوں کے جھونکے
رنج آتشدان میں رکھا ہوا ہے
جانے والے لوٹ کر آتے نہیں ہیں
ایسا کیا زندان میں رکھا ہوا ہے

یہ کس طلسم کدے میں صدا لگا بیٹھے
جواب میں عجب اک ڈر کلام کرنے لگا
کچھ اس طرح مرا باہر خفا ہوا مجھ سے
اک اجنبی مرے اندر کلام کرنے لگا
کسی صدا کی ضرورت ہی کب رہے گی سعید
اگر وہ لمس برابر کلام کرنے لگا

غزل

درد کے ساتھ جو زندان میں رہتا ہوں میں
کیا یہ کم ہے کہ ترے دھیان میں رہتا ہوں میں

کوئی روزن ہے کہیں بھی نہ ہوا ہے جس میں
ایسا لگتا ہے کسی کان میں رہتا ہوں میں

لوگ اب تیرے تعلق سے مجھے جانتے ہیں
اب ترے نام کی پہچان میں رہتا ہوں میں

ایک لمحے کو بھی مایوس نہیں ہوتا ہوں
اک ترے ملنے کے امکان میں رہتا ہوں میں

خواب میں سامنے رہتا ہے تمھارا چہرا
رات بھر ایک پرستان میں رہتا ہوں میں

تیرے خاکے تری یادیں ہی بہت ہیں مجھ کو
کون کہتا ہے کہ نقصان میں رہتا ہوں میں

گفتگو کرتا ہوں گاؤں میں درختوں سے کمال
شہر میں شور کے ہیجان میں رہتا ہوں میں

اشرف کمال

غزل

زندگی دیکھو! ہمارے خواب ہیں دہلیز پر
آپ سے کہنا ہے کچھ، بے تاب ہیں دہلیز پر

دیکھنا! جو ہے صدائے عشق وہ کمیاب ہے
آ گئے یونہی زرِ شب تاب ہیں دہلیز پر

سامنے ہونے کا مطلب دل میں ہونا تو نہیں
دل میں ہونے کے کئی آداب ہیں دہلیز پر

شام سے پہلے ہی دل میں آ گیا تیرا خیال
پھول، تارے، چاندنی، مہتاب ہیں دہلیز پر

آنکھ نے ظاہر نہیں ہونے دیا احساس کو
دکھ سنبھالے اس نے زیرِ آب ہیں دہلیز پر

آسماں رویا، زمیں بھیگی، فضا ٹھہری ہوئی
اب انیسؔ احمد کھڑے گرداب ہیں دہلیز پر

انیس احمد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہجر کا غم کچھ اور ہے، آنکھ کا نم کچھ اور شے
زیرِ چراغ آگہی نورِ ہنر نہیں تو کیا

غزل

آتی جاتی سانسوں نے دل سے بیوفائی کی
زندگی کے زنداں سے روح کی رہائی کی

خود سے بھی چھپا رکھتے بھید جو چھپانا تھا
بات لا کے ہونٹوں پہ تم نے خود پرائی کی

کھل گیا در توبہ مستجاب لمحوں میں
قلب و جاں کی اشکوں سے جب کبھی صفائی کی

جانے ہجر میں کب تک وصل کو ترسنا ہے
ختم ہی نہیں ہوتی رسم یہ جدائی کی

جھانک کر ذرا دل میں پھر جلیل بتلاؤ
بات زیب دیتی ہے تم کو پارسائی کی

احمد جلیل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دور کچھ بھی نہیں، اے جاں، تری دارائی سے
کبھی درّانہ گزر جا، مری تنہائی سے

غزلیں

اس تسلسل سے مجھے رنج بہم ہوتا ہے
بعض اوقات نہیں ہوتا تو غم ہوتا ہے

آخری ہو کہ بھلے پہلی محبت لیکن
خاص لوگوں پہ بڑا خاص کرم ہوتا ہے

راہیں احساس کی ہوتی ہیں ہم ایسوں سے جدا
دل جہاں دہر کے کہرام میں ضم ہوتا ہے

پیار تہذیب ہے اور دل نے سکھائی ہوئی ہے
آنکھ روتی نہیں اور تکیہ بھی نم ہوتا ہے

داستانوں میں چھپا جھوٹ کھنگالا تو کھلا
ایک افسانہ حقیقت سے رقم ہوتا ہے

ایک مدت کی مسافت کا نتیجہ جاذبؔ
اصل میں اپنی طرف ایک قدم ہوتا ہے

اکرم جاذب

روزِ اول سے جو قائم ہے وہ نسبت رہے گی
خاک سے خاک نشینوں کو عقیدت رہے گی

ابھی بند اشکوں کے آگے نہیں باندھا جاتا
مائلِ گریہ ابھی اپنی طبیعت رہے گی

یہی مفہومِ مساوات سمجھ آیا ہے
زیردستوں پہ وڈیروں کی حکومت رہے گی

حسنِ محبوب میں ہے حسنِ تصور نایاب
جو میسر ہے اسی چیز کی حسرت رہے گی

رفتہ رفتہ پھر اسی دھوکے میں آجاؤ گے
اور کچھ روز حسیں رنگ سے وحشت رہے گی

کچھ بھی حالات ہوں آئے گا مرا ردِ عمل
جب تلک پاس یہ احساس کی دولت رہے گی

اس سرائے میں نہ جی اپنا لگانا جاذبؔ
آپ کو چھوڑ کے جانے میں سہولت رہے گی

غزل

شاید کبھی گزر ہو ادھر سے ہوائے خواب
ہم نے بھی آنکھیں میچ کے رکھیں برائے خواب

پھر ایک روز نیند کی تتلی بھی اڑ گئی
پلکوں پہ ایک عمر تو ہم نے بٹھائے خواب

کچھ روز میری آنکھ سے اوجھل رہا ہے تُو
کچھ روز میں نے اوڑھ کے رکھی ردائے خواب

کھویا رہا وہ شخص بھی یاروں کی بھیڑ میں
ہم نے بھی ایک خواب سے کتنے بنائے خواب

اس سے کہو یہ آگ کا، پانی کا کھیل ہے
اس سے کہو کہ سوچ کے دیکھے، دکھائے خواب

دشتِ طلب میں آگ اگلتے سراب ہیں
اور ایسی تیز دھوپ کہ آنکھیں چرائے خواب

مدت ہوئی وہ اجنبی دیوار گر چکی
آنکھوں کو آ رہے ہیں ابھی تک پرائے خواب

اے کاش جلد خاک کو چھو کر بنیں گلاب
قدموں تلے جو آپ کے ہم نے بچھائے خواب

ٹوٹی ہوئی منڈیر پہ اوندھا ہوا چراغ
سونی پڑی ہے شام سے شاہدؔ سرائے خواب

افتخار شاہد

غزل

جاں بلب تھا غضب کی پیاس سے میں
سیر ہوتا بھی کیا گلاس سے میں

اُس کی خوشبو لپٹ گئی مجھ سے
آج گزرا تھا اُس کے پاس سے میں

ریل کی آخری بجی سیٹی
اور اُلجھا رہا حواس سے میں

مجھ کو گندم کا بوجھ ڈھونا تھا
سوت لیتا بھی کیا کپاس سے میں

جسم چھلنی ہوا ہے اندر سے
ٹھیک دِکھتا تو ہوں لباس سے میں

نااُمیدی کی جب چلے آندھی
باندھ لیتا ہوں دل کو آس سے میں

ہو اجازت تو کاٹ لوں ارشدؔ
پیٹ پالوں گا خشک گھاس سے میں

ارشد محمود ارشد

غزل

آج پھر ڈستی رہی مجھ کو مری تنہائی
آج بھی تم سے مری بات نہیں ہو پائی

آتے جاتے ہوئے ہر قافلے سے پوچھ لیا
آج بھی لوٹ کے آیا نہ مرا ہرجائی

میں نے یہ سوچ کے پھر دل کو تسلی دے لی
کیا کبھی ہاتھ میں آتی ہے کوئی پرچھائی

اتنی مشکل تو چڑھائی میں نہیں آئی تھی
جتنی مشکل میں مجھے ڈال گئی انگڑائی

میں نے چاہا تھا کہ جی بھر کے تجھے دیکھوں گا
پھر جھلک دیکھتے ہی آنکھ مری بھر آئی

عمران اعوان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سوندھی سوندھی سوچ سے اُٹھی، جذبوں کی مہکار
راہ مہک کی روک نہ پائی، لفظوں کی دیوار

غزل

عین ممکن ہے اُسے کچھ یاد آئے دیکھ کر
وہ بھری محفل میں ہم کو مسکرائے ، دیکھ کر

کھل اُٹھی رنگت جو دیکھا روبرو چہرہ وہی
دل پہ قابو ہم بھی اپنے رکھ نہ پائے ، دیکھ کر

ترکِ الفت پر تو ہم قائم تھے لیکن کیا کریں
ان کی خواہش دل میں اب بھی سَر اُٹھائے، دیکھ کر

ہم خود نجانے سوچ کر آئے تھے کیا
وہ پگھل کر موم ہو، وہ مان جائے ، دیکھ کر

جانے کِس دُشمن کا ہے یہ مشورہ کہ بزم میں
غیر کی جانب ہمارا دِل دکھائے ، دیکھ کر

دل ہمارا دھڑکا رخشندہ اچنبھا تو نہیں
شاخ پر پنچھی اُن کو پھڑپھڑائے ، دیکھ کر

رخشندہ نوید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ بھید کھلا معرفتِ شام و سحر سے
دن، شب سے جدا ہے نہ الگ عجیب، ہنر سے

غزل

ختم ہو جائے گا ہوا کا ڈر
لو سے لڑتی ہوئی دعا کا ڈر

خامشی سے الجھ نہیں سکتا
کپکپاتی ہوئی صدا کا ڈر

میرے خستہ مکاں کا حصہ ہے
آندھیوں اور تجھ گھٹا کا ڈر

بے وفائی سے روکتا ہے مجھے
بے بسی کرب غم جفا کا ڈر

نرم لہجے میں بات کرتا ہے
جس کے دل میں رہے خدا کا ڈر

ملیحہ سیّد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کوئی پوچھے تو کہیں غیر تھا یا اپنا تھا
ایک چہرے کے سوا شہر میں کیا اپنا تھا

غزل

وہ بالیقین نبی کا غلام ہے ہی نہیں
کہ جس کا خوف تو ہے احترام ہے ہی نہیں

فلک سے اُترے ہوؤں کا مقام ہے ہی نہیں
وہاں کے جیسی یہاں دُھوم دھام ہے ہی نہیں

یہ ایک بات مسلسل مجھے ستاتی ہے
حقیقتاً تو کوئی بھی نظام ہے ہی نہیں

عجیب تر ہے بھری کائنات کا منظر
شروع ہو تو کہیں اختتام ہے ہی نہیں

جسے مٹانے کی دُھن ہے نہیں وجود اس کا
جسے اچھال رہے ہو وہ نام ہے ہی نہیں

وہ اور ہیں جو مسائل کے حل سُجھاتے ہیں
تُو صرف جی کہ مجھے تجھ سے کام ہے ہی نہیں

میں فکرمند نہیں ہوں کہ یہ بساطِ جہاں
کسی کا ہوگا، مرا انتظام ہے ہی نہیں

شکست و ریخت پہ فوری نہ رائے قائم کر
نمو کی شرط ہے یہ، انہدام ہے ہی نہیں

نگلتا جاتا ہے کارِ عبث مرے دن رات
کہ شورِ شہر میں کچھ لطفِ شام ہے ہی نہیں

لغت میں لفظ ''وفا'' کے کئی معانی ہیں
سوا اپنی شرع میں بدعت حرام ہے ہی نہیں

نمود و نام، ستائش، صلہ نہیں درکار
سخن وری تو مری تام جھام ہے ہی نہیں

سمجھ نہ لینا کہیں خود کو زندگی سے بڑا
یہاں کسی کو بھی پیارے دوام ہے ہی نہیں

صائمہ آفتاب

غزلیں

چھا گئی رات شام سے پہلے
کیا ہوئی مات شام سے پہلے

اک ملاقات خواب میں ممکن
اک ملاقات شام سے پہلے
کچھ مناجات رات کو ہوں گی
کچھ مناجات شام سے پہلے

مل گیا دن میں وہ ستارا نما
بن گئی بات شام سے پہلے

ڈھونڈتے ہیں دیے شفیق آصف
کون تھا ساتھ شام سے پہلے

شفیق آصف

حدیثِ محبت کی توقیر ہیں ہم
زمانے کی ظلمت میں تنویر ہیں ہم

کھلی آنکھ سے تم نے دیکھا ہے جس کو
اُسی خواب راحت کی تعبیر ہیں ہم

تری شہر بھر سے محبت ہے برحق
کہاں تیرے پاؤں کی زنجیر ہیں ہم؟

جسے آنے والے پرندے پڑھیں گے
ہواؤں پہ لکھی وہ تحریر ہیں ہم

نئے برگ وگل ہم سے پھوٹیں گے آصف
نئے موسموں کی وہ تصویر ہیں ہم

غزل

جہاں کی کچھ خبر پاتا تو ہوگا
کسی کا وہ بھی کہلاتا تو ہوگا

چلو لب کھولنے کی بات چھوڑو
کسی دل میں سوال آتا تو ہوگا

اُجالے کی خبر رکھتا نہیں میں
اُجالے میں نظر آتا تو ہوگا

سبھی ناصح مرے پیچھے پڑے ہیں
کوئی اُس کو بھی سمجھاتا تو ہوگا

تصور کے مطابق واقعہ ہو
ترے جی میں بھی یہ آتا تو ہوگا

ہر اِک کی چہچہاہٹ ہے سُریلی
نوا رکھتا ہے جو گاتا تو ہوگا

یہ کافی ہے سحرؔ ترکِ سفر کو
کہ رستہ ہے کہیں جاتا تو ہوگا

حسنین سحر

غزل

بنائے رنج فراہم تو ہے کہیں نہ کہیں
نظر نہ آتا ہو، اک غم تو ہے کہیں نہ کہیں

جو ہر خوشی کے کنارے بھگوئے رکھتا ہے
نمک ملا ہوا اک نم تو ہے کہیں نہ کہیں

کرید اور ذرا ممکنت کی درزوں کو
پکارتا ہے جو پیہم تو ہے کہیں نہ کہیں

تو لاعلاج نہیں، نارسا ہے زخمِ وجود
تجھے ملا نہیں، مرہم تو ہے کہیں نہ کہیں

وہ جس کے آنے کی آہٹ ہے تیرے لہجے میں
کوئی گریز کا موسم تو ہے کہیں نہ کہیں

ہے ایک سائے کی لرزش یہاں وہاں دل پر
کسی نگاہ کا پرچم تو ہے کہیں نہ کہیں

عابد سیال

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد مجھے منظور نہ تھا جاں سے گزرنا
گھر بیٹھ رہا باندھ کے پیمانِ وفا میں

غزلیں

آنے جانے میں رک گیا ہوں میں
اک تماشے میں رک گیا ہوں میں

وہ کسی اور کا نظارہ ہے
جس نظارے میں رک گیا ہوں میں

کوئی ہے جو نکال دے مجھ کو !
ایک لمحے میں رک گیا ہوں میں

سانس لینے میں ہو گئی دقت!
تیرے سینے میں رک گیا ہوں میں

کوئی ذہنی مطابقت ہی نہیں
ایک خدشے میں رک گیا ہوں میں

اور پھر کائنات ختم ہوئی
پہلے خانے میں رک گیا ہوں میں

تتلی بیٹھی ہے پھول پر شاہدؔ
اور ایسے میں رک گیا ہوں میں

اشرف شاہد

سینے میں پھیلتی ہوئی خواہش کے زور سے
دل مان ہی گیا مری کوشش کے زور سے

دنیا سے اپنا ہاتھ چھڑا کر میں آ گیا
آنکھوں کی ایک ہلکی سی جنبش کے زور سے

پہلے پہل جھجک ہوئی چھتری میں ایک ساتھ
پھر ہم سمٹ کے رہ گئے بارش کے زور سے

اب واپسی کی بات, نہ سود و زیاں کی فکر
دل لے گیا جہاں مجھے خواہش کے زور سے

اُس کے کہیں قریب سے میرا گزر ہوا
پھر خود ہی گھومتا رہا گردش کے زور سے

آخر کو دل کے کہنے پہ شاہدؔ دماغ نے
سر کو جھکا لیا ہے سفارش کے زور سے

غزلیں

جو ڈھیر کتابوں کا ہے حصے میں ملا ہے
یہ فن و ادب تو مجھے ورثے میں ملا ہے

گزرا کوئی مزدور یقیناً ہے یہاں سے
جوتا مجھے ٹوٹا ہوا رستے میں ملا ہے

ٹوٹا سا قلم، خواب سنہرے، دو کتابیں
کھویا ہوا بچپن مجھے بستے میں ملا ہے

ماجد یزدانی

اک تباہی مچاتے گزر جائے گا
اب یہ سیلاب جانے کدھر جائے گا

خواب بن کے تعلق بکھر جائے گا
کیا خبر تھی وہ دل سے اتر جائے گا

جب بھروسہ عدالت سے اٹھ جائے گا
کون انصاف لینے ادھر جائے گا

وہ جو حالات سے اپنے ڈر جائے گا
جیتے جی ہی یقیناً وہ مر جائے گا

اب الجھا ہوا خود ہی سے یہ پوچھ رہا ہوں
یہ میں تو نہیں عکس جو شیشے میں ملا ہے

دل کہتا ہے ماجد میں گلے اس کو لگا لوں
بچھڑا ہوا اک یار جو رستے میں ملا ہے

آج پھر نہ مشقت کے پیسے ملے
پھر دلاسا لئے آج گھر جائے گا

تیز آندھی سبھی گھونسلے لے گئی
پہلے پتے گرے، اب شجر جائے گا

بادلوں نے لپٹ کے کہا چاند سے
آسماں سے پرے اب کدھر جائے گا

غزلیں

کار دنیا میں فرشتوں کی طرح ہوتا ہے
''آدمی عشق میں بچوں کی طرح ہوتا ہے''
اُس کے منزل کی طرف خود ہی قدم اُٹھتے ہیں
جب کوئی شہر کے رستوں کی طرح ہوتا ہے
جس کے لہجے سے محبت کی مہک آتی ہو
گفتگو میں وہ گلابوں کی طرح ہوتا ہے
کوئی آسیب مسلّط ہے گلی کوچوں میں
دن نکلتا ہے تو راتوں کی طرح ہوتا ہے
توڑ کر بھی وہ جڑا رہتا ہے اندر اپنے
اب کہاں کوئی کھلونوں کی طرح ہوتا ہے

محمد نوید مرزا

جب سے میں ہوں ترے خیال میں گم
اک اُجالا ہے خدوخال میں گم
راستے گرد گرد ہیں جب سے
ہر مسافر ہے اک وبال میں گم
خود بخود رہگزر بناتا ہے
ہر پرندہ ہوا کے جال میں گم
سن رہا ہوں صدا قلندر کی
ہو رہا ہوں کسی دھمال میں گم
کون اب اُس کا انتظار کرے
کوئی کب تک رہے ملال میں گم

جُھوم اُٹھتا ہے ذرا سی بھی خوشی ملنے پر
دل دھڑکتا ہے تو شاخوں کی طرح ہوتا ہے
اُس کو لشکر میں سبھی لوگ جری کہتے ہیں
فرد ہو کر جو قبیلوں کی طرح ہوتا ہے
صبح تک اُس پر اُترتے ہیں قطاروں میں نوید
شام کو پیڑ پرندوں کی طرح ہوتا ہے

ماورا ہے تُو ہر تخیل سے
روشنی ہے ترے جمال میں گم
نقش سب کے بنا رہا ہے وہی
میں بھی ہوں دست لازوال میں گم
جب گزشتہ تلاش کرتا ہوں
ہونے لگتا ہوں اپنے حال میں گم

غزل

خوشی کی بزم نہ دنیا شناس لوگوں میں
تجھے ملوں گا ہمیشہ اُداس لوگوں میں

میں آئنے کو کبھی دیر تک نہیں تکتا
یہ بانٹتا ہے محبت کی پیاس لوگوں میں

میں اختیار میں اپنے کبھی نہیں رہتا
مرا شمار کرو بد حواس لوگوں میں

اسے کہو کہ مجھے قید سے رہائی دے
وہ جس نے مجھ کو بٹھایا ہے خاص لوگوں میں

جدید دور کے ذہنوں میں پائے جاتے ہیں
قدیم دور کے وہم و قیاس لوگوں میں

کبھی سنیں تو انھیں ہضم ہی نہیں ہوتی
ہمارے شعر کی تعریف خاص لوگوں میں

وہ آئنے کے فقط ایک رخ سے واقف ہیں
نکالتے ہیں جو دل کی بھڑاس لوگوں میں

ہمارا کام ہے چہروں کو جاننا صاحب!
ہمارا نام ہے مردم شناس لوگوں میں

کیا ہے رات ستاروں نے کچھ اشاروں میں
ہمارا ذکر ستارہ شناس لوگوں میں

ہم ان کو ہجر کے کچھ فائدے بتائیں گے
ہمارے شعر پڑھیں محو یاس لوگوں میں

اسحاق وردگ

غزل

تجھ کو پانے کی ٹھان لی میں نے
کتنی اُونچی اُڑان لی میں نے

جینا دشوار ہو گیا تھا مرا
چند خوابوں کی جان لی میں نے

اب کوئی اور کام کرنا ہے
خاک جتنی تھی چھان لی میں نے

اک تعلق کو جیتنے کے لیے
دفعتاً ہار مان لی میں نے

گاہکوں کی رسائی مشکل ہے
اتنی اُونچی دکان لی میں نے

ایک بستر بچھایا مٹی کا
ایک چادر بھی تان لی میں نے

تجھ کو آسانیاں تو دیں لیکن
دیکھ کتنی تھکان لی میں نے

جاں ہتھیلی پہ لے کے نکلا ہوں
کب کسی کی امان لی میں نے

شکریہ میر و غالب و مومن
جن سے اُردو زبان لی میں نے

مظہر حسین سیّد

غزل

میں بکھرتی رتوں کی سودائی
زندگی ہے کہ شام تنہائی

مختصر کس طرح کہانی ہو
ایک ہی بات جب ہے دوہرائی

لمحہ بھر میں بدل گیا منظر
کھا گئی زندگی کو رسوائی

عشق کی گتھیاں ہیں اور ہم ہیں
چھوڑ جاتی ہے ساتھ دانائی

مجھ کو چھپ چھپ کے دیکھنے والا
ہے کسی اور..... . . کا تمنائی

تجھ سے ملنے کا جس میں امکاں تھا
پھر وہ رت لوٹ کر نہیں آئی

فیصلہ کس طرح سے ممکن ہو
آگ پیچھے ہے سامنے کھائی

ضبط نے اشک اس طرح روکے
میری آنکھوں پہ جم گئی کائی

کھوئی کھوئی سی مضمحل ، چپ چاپ
رات جیون میں پھر اتر آئی

چاندنی،درد ،یاد، تنہائی
یوں بھی ہوتی ہے بزم آرائی

کس طرح اک مقام پہ ٹھہریں
ہجر کی شام ، اور وہ ہرجائی

کیسا منظر ہے سامنے سید
خود تماشا ہوں خود تماشائی

ثمینہ سید

غزل

روشنی ہے، رتجگے ہیں آئنوں کے شہر میں
آپ جب سے آ گئے ہیں آئنوں کے شہر میں

چشمِ حیرت سے ہمیں بھی تک رہے ہیں شیشہ گر
ہم بھی جیسے آئنے ہیں آئنوں کے شہر میں

بٹ گئے ہیں بس گروہوں میں سبھی اہلِ نظر
دائرے ہی دائرے ہیں آئنوں کے شہر میں

اہلِ عرفاں سے کہو، اِس کی وضاحت کر سکیں
ہم بُرے ہیں یا بھلے ہیں آئنوں کے شہر میں

دیکھتے ہی دیکھتے پتھر ہوئے ہیں آئنے
آئنے پتھر ہوئے ہیں آئنوں کے شہر میں

آئنوں کو کر دیا کس نے مکدّر دوستو
چار سو پتھر سجے ہیں آئنوں کے شہر میں

پتھروں سے اِن کی نسبت ہو نہیں سکتی کبھی
آئنے پھر آئنے ہیں آئنوں کے شہر میں

ہیں مثالِ آئنہ اِس شہر میں کچھ اور لوگ
ہم تمھیں کو ڈھونڈتے ہیں آئنوں کے شہر میں

ریزہ ریزہ دیکھیے اب کون چُنتا ہے ندیمؔ
جا بجا بکھرے پڑے ہیں آئنوں کے شہر میں

ریاض ندیم نیازی

غزل

ہیولہ گزرے گا جسموں کے آر پار مرا
کہ انحراف کا عنصر ہے تاب کار مرا

نہار و لیل کے وقفے میں چلتا رہتا ہے
سمے میں لا پتہ ہونے کا اشتہار مرا

بلند ہونے لگی سطح، دل کے دریا کی
پگھلتا جاتا ہے باطن کا برف زار مرا

نظامِ وقت مرا ہَیک کر لیا گیا ہے
چُرا لیا گیا صدیوں کا اعتبار مرا

کبھی حقیقتِ اشیا نہ کھل سکی مجھ پر
حواسِ خمسہ پہ جب تک تھا انحصار مرا

نگر میں قحط پڑا، جنگلوں میں آگ لگی
گرہ ہے موسمی آفات کا شکار مرا

کہاں کہاں مری موجِ نفس نہیں جاتی
کہاں کہاں نہیں پھیلا ہوا غبار مرا

شکست اپنے ہی احباب سے ہوئی دل کو
خود اپنے حلقے میں ہارا اُمید وار مرا

مکانِ سبز کی گیسیں تپش کا باعث ہیں
ہوائے گرم سے گلشن ہے شعلہ زار مرا

ہر اک طرف سے ہی غم کا کھچاؤ یکساں ہے
توازن اِس لیے اب تک ہے برقرار مرا

جو دیکھے کوئی تو مخفی ہے آنکھ سے شاہد
نہ دیکھے کوئی تو منظر ہے آشکار مرا

شاہد ماکلی

غزل

مَیں یہاں اور تُو وہاں مرے دوست
اور دنیا ہے درمیاں مرے دوست

قصہ گو ہچکیوں میں ڈوب گیا
ختم ہوتے ہی داستاں مرے دوست

ڈھونڈتے ہیں کِسے در و دیوار
منتظِر کس کا ہے مکاں مرے دوست

رات دن سوچتے تھے بس تجھ کو
ویسی فرصت ہے اب کہاں مرے دوست

تیری مشقِ ستم کو ہم حاضر
یہ رہے تیر، یہ کماں مرے دوست

بس کوئی پَل کا ساتھ ہے اپنا
جانے والا ہے کارواں مرے دوست

روح پر جسم تک اضافی ہے
چھوڑ دوں گا یہ خاکداں مرے دوست

تیرا اس میں کوئی قصور نہیں
مجھ کو جانا تھا رائیگاں مرے دوست

وہ جو تھی تیز لَو محبت کی
رہ گئی ہے فقط دھواں مرے دوست

اعجاز ثاقب

غزلیں

کچھ کجی آپ میں ہے یا مرا ٹیڑھا پن ہے
شخصیت میں وہی پہلے سا ادھورا پن ہے

اک تعلق ہے تعلق نہیں جس کو کہتے
میرا اپنا تو یہی ان کا پرایا پن ہے

حرص سنجیدہ ہے مقصد کے لیے حرف بہ حرف
اور معصوم کی فطرت میں کھلنڈرا پن ہے

بزم آرائی سے بس اتنا سمجھ پائی ہوں
میری خوشیوں کا سبب میرا اکیلا پن ہے

جانے بے فیض ہیں اسباب و وسائل کتنے
کتنے دریاؤں کی تہذیب میں سوکھا پن ہے

آج آنکھوں سے اتارا ہے کئی دن کا غبار
عنبرین آج تو ماحول میں اُجلا پن ہے

عنبرین خان

تیرا لہجہ تری صورت تری آواز سے ہم
کس قدر آ گئے نزدیک کسی راز سے ہم

رات سوئیں تو ترا ہاتھ ہو سر کے نیچے
صبح اٹھیں تو فقط اک تری آواز سے ہم

بھر گئے تم تو اُڑان ایک ہی لمحے میں مگر
اور محروم ہوئے خواہشِ پرواز سے ہم

پھر در دل پہ کبھی آئیں گے دستک دینے
ہارنے والے نہیں دوست تگ و تاز سے ہم

شکریہ میرے مسیحا تا قیامت جیے تو
پھر سے جی اٹھے ہیں اس پیار کے اعجاز سے ہم

غزل

جب اِک فقیر نے دی تھی اُسے دعا چپ چاپ
سمیٹنے میں مگن تھا دیا ہوا چپ چاپ

مجھے ہجوم سے درکار تھا قیام سو میں
کسی کا ہاتھ پکڑ ہی نہیں سکا چپ چاپ

جو کھو گیا تھا مری دسترس سے باہر تھا
مگر میں پھر بھی اُسے کھوجتا رہا چپ چاپ

مجھے یہ غم ہی بہت ہے کہ تُجھ سے مل نہ سکا
اے مہرباں تُو مجھے اب نہ یاد آ چپ چاپ

معاملاتِ محبت کی بات تھی ہی نہیں
اسی لیے تو پڑی تھی تری رضا چپ چاپ

نعیم رضا بھٹی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آنکھیں خوشبو کی طرح اُٹھ کے بکھر جاتی تھیں
جانے کس موج میں وہ جانِ صبا اپنا تھا

غزلیں

تمہارا ساتھ ہے تو روشنی سے نسبتیں ہیں
تمہارے وصل سے پیدا یہ کیسی رفعتیں ہیں

بنے ہیں جو ستارے استعارہ منزلوں کا
تمہاری وسعتوں میں کچھ یہ میری حیرتیں ہیں

تمہارے نقش پا نے جو مرتب کر دیے ہیں
وہ رستے ہی ہماری جستجو کی منزلیں ہیں

ہمارے حرف کیا ہیں اور ہماری فکر کیا ہے
دل و جاں میں سرایت خوبصورت صورتیں ہیں

بشیر احمد حبیب

امید کے شجر پہ کھلے خشک پھول تھے
جو غم کی آندھیوں میں بھی صحرا کی دھول تھے

جب جیتے جی وہ شخص مرا ہو نہیں سکا
اگلے جہاں میں وصل کے وعدے فضول تھے

میرا تو ماہ و سال نے چہرہ بدل دیا
تیری نظر میں تازہ گلابوں کے پھول تھے

ترے پیہم تغافل نے یہ ثابت کر دیا ہے
کسی کی سوچ میں رہنا بھی گویا قربتیں ہیں

ہزاروں میں ہمیں کو یوں نظر انداز کرنا
تغافل میں جو پنہاں ہیں وہ ان کی چاہتیں ہیں

وہ بزم کیا چھٹی کوئی مطلب نہیں رہا
گرد و نواحِ شہر میں اگتے ببول تھے

ہم ایک ساتھ رہتے ہوئے مل نہیں سکے
یہ کس کے فیصلے تھے یہ کیسے اصول تھے

غزل

سیرِ گُل کو جو کبھی صاحبِ من جایئے گا!
پتّی پتّی کو تپاں پوروں سے سہلایئے گا!

خام ہے آپ کا نظروں میں تپش کا دعویٰ
برف منظر کو اگر چھو کے ہی پگھلایئے گا!

تنگ ہے عمر کے اس اَنگ پہ لمحوں کی قبا
شوخ جذبوں کو ذرا سمجھ کے گدرایئے گا!

گُمسُما کر جو غزل رہ میں جھُڑائے آنچل
اپنی مستانہ روی سے اُسے بہکایئے گا!

لوچ پر اس کے کرے رشک ہواؤں کا بدن
مصرعہِ شنگ کو اِس طرح سے مَسکایئے گا!

رَم کرے آپ کے پہلو میں پہنچ کر ہرنی
اس سے بہتر ہے کہ جنگل سے نکل جایئے گا!

سب ستارے اِسی خوش بخت کے قدموں میں گریں
آسماں کو کچھ اس انداز سے جھٹکایئے گا!

بیٹھیے! اور بھی کرنی ہیں ضروری باتیں
ایک تو یہ کہ دوبارہ نہ یہاں آیئے گا!

نیلم ملک

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

میرے ہونٹوں پہ ہے سب کے دل کی
ڈھونڈیے اپنے ہی اندر مجھ کو

غزل

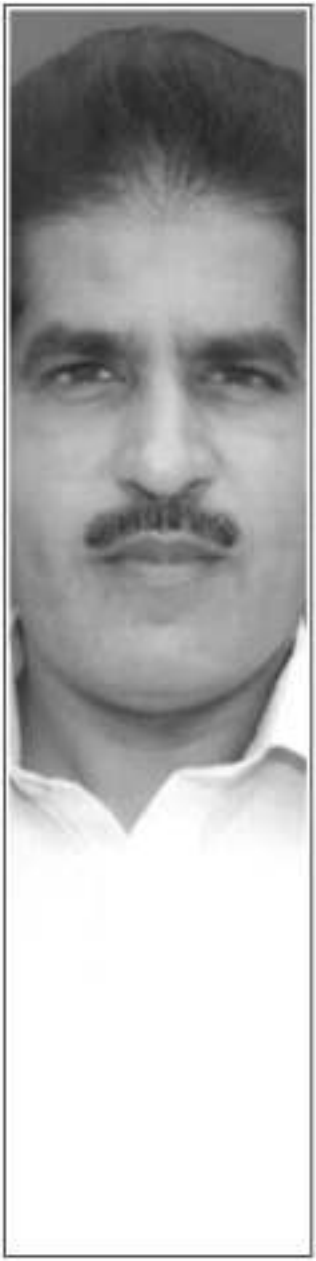

نہ قزّاقوں نے چھوڑا ہو جہاں پر معبدوں کو
وہاں محفوظ کیسے رکھ سکے کوئی گھروں کو

وہ دُھن پرواز کی تو ختم کر ڈالی قفس نے
کروں کیا میں نمو پاتے ہوئے اپنے پروں کو؟

میں دشتِ نارسائی سے نکل پایا نہیں ہوں
تو کیسے چُھو سکوں شہرِ تمنا کی حدوں کو؟

درونِ ذات کچھ پاؤں جمالوں میں خودی کے
زمیں تک کھول دوں گا آسماں کے سب دروں کو

مرا گھر جل اُٹھا جب آسمانی بجلیوں سے
سکوں سا آگیا بغلیں بجاتے دشمنوں کو

کھلونے پر تنازع ہے جو بچوں میں ذرا سا
تو کیوں پھر کھینچتے ہو بے جواز اس میں بڑوں کو

رواں کب سے ہے اور کب تک رہے محوِ سفر یہ
کوئی کھو دے گا کیا نخلِ زمانہ کی جڑوں کو؟

دِیے احساس کے فرحاںؔ جلا کر جسم و جاں میں
ندا دینے لگے خود ہی انا کی آندھیوں کو

سرور فرحان

غزل

کہاں سے آیا ہے کچھ بھی کہاں بتاتا ہے
بس اپنے شہر کو شہرِ گماں بتاتا ہے

عجب خراب سی عادت پڑی ہوئی ہے اسے
جہاں وہ ہوتا نہیں ہے وہاں بتاتا ہے

ہم آنکھ رکھتے ہیں پھر بھی خبر نہیں ہوتی
کہاں پہ آگ لگی ہے دھواں بتاتا ہے

بہت قدیم رفاقت کے باوجود اب بھی
زمیں کی بات ہمیں آسماں بتاتا ہے

کہانی ختم نہیں ہو رہی ہے اب اس سے
ہر ایک کو وہ ابھی درمیاں بتاتا ہے

ہزار بات سے واقف ہو ناخدا پھر بھی
ہوا کا زور اسے بادباں بتاتا ہے

ہے چشم دید گواہوں میں گرچہ نام اُس کا
مگر کچھ اور ہی اُس کا بیاں بتاتا ہے

مرا خیال ہے وہ عشق میں پڑا ہی نہیں
جو کارِ عشق کو کارِ زیاں بتاتا ہے

طارق نعیم

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

پانی اُتر گیا ، مگر آنکھیں بجھا گیا
سیلِ جمال اپنا نشاں تک مٹا گیا

غزل

خاموش فضا بتا رہی ہے
دو چار قدم پہ زندگی ہے

پنچھی یہ صدائیں دے رہے ہیں
اُس پار کہیں گھٹا اُٹھی ہے

ہوں لاکھ جدا ہمارے رستے
منزل تو ہماری ایک ہی ہے

اے ہجر کی شب ! یہ روتے روتے
کس شخص کی آنکھ لگ گئی ہے

جس گھر کے چراغ بُجھ گئے تھے
اُس گھر میں ابھی بھی روشنی ہے

روتا ہوا دل یہ کہہ رہا ہے
منزل ترے سامنے کھڑی ہے

ہونا ہے ظہور ابھی وہ چہرا
کچھ گرد مگر جمی ہوئی ہے

ظہور چوہان

غزل

خیر سے وہ بھی خیر اندیش تمہارا تھا
جس نے مجھ کو پہلا پتھر مارا تھا

اپنے دشمن سے بھی جس کی یاری تھی
ایسا بھی اک یار غار ہمارا تھا

جس کی کوئی خیر خبر معلوم نہیں
ایک وہی تو شہر میں اپنا پیارا تھا

بھاگنے والے پھر میدان سے بھاگ گئے
ایک ذرا سا دشمن نے للکارا تھا

میں نے اپنے جانی کو تکلیف نہ دی
میں نے اپنا سر بھی آپ اتارا تھا

انصر حسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یار کس آن بان سے گزرے تھے اپنی جان سے
مُردے گڑے، اُکھاڑ کر رکھ دیے کھیل کھیل میں

غزل

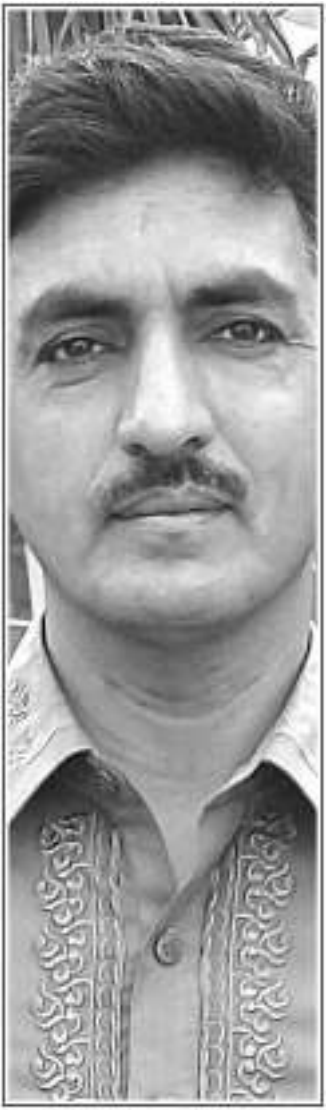

شعر سے مسکرانے لگتا ہوں
رات کو دن بنانے لگتا ہوں

نیند سے اک یہی شکایت ہے
خود کو میں پھر جگانے لگتا ہوں

مجھ سے ہمزاد بھی نہیں ملتا
میں کہاں آنے جانے لگتا ہوں

عشق بھی قیمتی خزانہ ہے
دوسروں سے چھپانے لگتا ہوں

جیب خالی اگر ہو دولت سے
دل کا دریا بہانے لگتا ہوں

مجھ کو آسان کیوں سمجھتے ہو
مشکلوں سے ٹھکانے لگتا ہوں

بھول جاتا ہوں اب تجھے اکثر
تیرے جیسا زمانے لگتا ہوں

امجد بابر

غزل

جب ہم بنے تھے یار دو
کیسا تھا دو ہزار دو

ہوں میں شکستہ پا بہت
بگڑی ہوئی سنوار دو

مجھ پر نہ کرو حکمرانی
خود پہ بھی اختیار دو

قسمت پہ دسترس ہے کب
جیسی بھی ہے گزار دو

لہجے کے اعتماد سے
لفظوں کو اعتبار دو

نقشِ کہن بنوں گا میں
صدیوں کا انتظار دو

فرصت ملے تو آ ملو
بیٹھیں گے خاکسار دو

آنکھیں ہیں اُس کی یا کوئی
خنجر ہیں آب دار دو

اِک پل ذرا سکوں نہیں
آؤ مجھے قرار دو

ہاتھوں میں ہاتھ تھام لو
پھر سے مجھے نکھار دو

کب سے خزاں بدست ہوں
دائم رواں بہار دو

علی حسین عابدی

غزل

غبارِ زندگانی ہے ہوا سے اُڑ بھی سکتا ہے
پریشانی کے عالم میں خُدا پر ایک تکیہ ہے

بہتر تن دیے تھے کربلا میں دین کی خاطر
خیال خام ہے تیرا کہ پانی آج سستا ہے

چھپا رکھا ہے ہر اک راز سینے میں جہاں والو
ہمارا دل حقیقت میں سمندر سے بھی گہرا ہے

خدا توفیق دے گر تو بھلائی کر خدائی سے
خدا کے ہاں صلہ اس کا توقع سے زیادہ ہے

اسے پڑھ کر اٹھاؤ لطف آخر تم بھی شاعر ہو
مری تازہ غزل سچ مُچ تصور ایک تحفہ ہے

تصور اقبال

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خاک پر خاک کی ڈھیریاں رہ گئیں
آدمی اُٹھ گئے ، نیکیاں رہ گئیں

غزل

مشغلہ شعر گوئی ہے صاحب
ہم سا پاگل بھی کوئی ہے صاحب

فصل غم کی میں آپ کاٹوں گا
اپنے ہاتھوں سے بوئی ہے صاحب

رات کا شکریہ ادا کر دوں
میرے ہم راہ روئی ہے صاحب

آرزو کو جگانے مت آنا
شور کر کر کے سوئی ہے صاحب

میری باتیں جسے سمجھ آئیں
شہر میں کوئی کوئی ہے صاحب

سرد راتوں میں کام آتی ہے
یاد بھی گرم لوئی ہے صاحب

ناؤ کا پوچھتے ہو کیا مجھ سے
ناخدا نے ڈبوئی ہے صاحب

میں اکیلا بجھا بجھا تو نہیں
شام بھی کھوئی کھوئی ہے صاحب

طالب انصاری

غزل

حکیم خان حکیم

دھوپ ہے سائباں نہیں ملتا
سر پہ اب آسماں نہیں ملتا

یوں مقفل ہیں سب کے دروازے
کوئی خالی مکاں نہیں ملتا

شہر تو ہے بہت بڑا لیکن
زندگی کا نشاں نہیں ملتا

تو مرے ساتھ چل نہیں سکتا
مجھ سے تیرا گماں نہیں ملتا

پھول بکھرے ہوئے ہیں گلشن میں
باغ میں باغباں نہیں ملتا

اب تو آنکھوں میں دھول اُڑتی ہے
تیرا نام و نشاں نہیں ملتا

لوٹ آیا ہوں آسماں سے میں
مجھ کو میرا جہاں نہیں ملتا

سوچیے تو نظر نہیں آتا
ڈھونڈیے تو کہاں نہیں ملتا

غزل

اُس کی خفگی بھی تعلق کی علامت نکلی
میں نے نفرت جسے سمجھا تھا، محبت نکلی

اُسکی مُسکان سے خوش ہوتی ہے کتنی خلقت
اُسکے مُسکانے کی عادت بھی عبادت نکلی

وہ جو تھی پہلی ملاقات میں بیٹھی گُم صم
وہ تو بس چار دنوں میں ہی قیامت نکلی

میرا تُو یار بنا بھی تو اُسی کی خاطر
جس کو سمجھا تھا قرابت، وہ رقابت نکلی

نام دیتے ہیں جسے وصل کا اکثر شاعر
وہ تو فطرت کی عطا کردہ جبلت نکلی

گر خدا ہوتا تو مل جاتی معافی مجھ کو
وہ بھی انساں تھا کہ دل سے نہ کدورت نکلی

جب یہ سوچا کہ وہ کلیوں کو مسلتا کیوں ہے
یہ تو جابر کی نزاکت سے عداوت نکلی

اُس کی ہر بات کو سنجیدہ لیا تھا میں نے
اُس کی ہر بات مگر ایک شرارت نکلی

میٹھے لہجوں سے ضیؔا کھائے ہیں دھوکے اکثر
جس کو سمجھا تھا محبت، وہ تجارت نکلی

سید ضیا حسین

غزلیں

دن چڑھنے کی کمرے میں ضیا بھی نہیں آئی
کھڑکی سے تر و تازہ ہوا بھی نہیں آئی

آہٹ ترے جانے کی سنائی دی ذرا سی
پھر دل کے دھڑکنے کی صدا بھی نہیں آئی

دہلیز پہ تنہائی نے کیا پہرہ دیا ہے
آیا نہ کوئی ملنے ، صبا بھی نہیں آئی

کیا آگ سی دہکاتی رہی مجھ کو مسلسل
میں جلتا رہا اور جلا بھی نہیں آئی

شاداب علاقوں ہی میں ہوتی رہی بارش
صحرا میں امر پیاسی گھٹا بھی نہیں آئی

امر مہکی

دل سے نہیں نکلنے کی ایسی رچی کسک
دن رات، صبح و شام ہی ہونے لگی کسک

ہر وقت ہے نئے سے نئے درد کا الاپ
ہر لمحہ ہر گھڑی ہے نئی سے نئی کسک

پہلے بھی دل میں ہوتی رہی ہے چبھن مگر
اب کے ہے کچھ عجیب سی، بے نام سی کسک

جانے وہ کس کی یاد تھی دل میں رکی نہیں
دستک دی اور چھوڑ گئی بے کلی کسک

غزلیں

فتنہ ہے، تعصب ہے، بندوق ہے، گولی ہے
اِس شہر میں ہر لحظہ بس خون کی ہولی ہے

اک نام لیا اُس نے کچھ ایسی محبت سے
گویا مرے کانوں میں شیرینی سی گھولی ہے

پت جھڑ کی وہی شامیں، آنسو بھی نظر آئے
یادوں کی کوئی کھڑکی جب آنکھ نے کھولی ہے

اک بار نظر بھر کے دیکھا ہے مجھے اُس نے
اک آن میں یہ ہستی مخمور ہے ڈولی ہے

میرا نہ تھا وہ کل بھی، سمجھا ہے یہ اب میں نے
ہر بات محبت کی ادراک میں تولی ہے

جبرانؔ سیہ شب میں وہ مل نہ سکا ہم کو
ہر کنج میں ڈھونڈا ہے، ہر راہ ٹٹولی ہے

وسیم جبران

بہت مشکل تھا اب جو فیصلہ کرنے لگا ہوں
میں اپنے آپ کو خود سے جدا کرنے لگا ہوں
جو سچائی سنو گے تو بہت تڑپو گے تم بھی
میں دل کی بات میرے ہمنوا کرنے لگا ہوں
تعلق کچھ تو باقی ہے ہمارے دل کا اب بھی
میں تنگ آ کر جواب تم سے گلہ کرنے لگا ہوں
اسے تخریب سمجھو یا بغاوت کچھ بھی کہہ لو
قفس کو توڑ کر پنچھی رہا کرنے لگا ہوں
مسیحا تو نہیں ہوں جو بھروں میں زخم دل کے
میں ہمدردی سے ہی سب کا بھلا کرنے لگا ہوں

بھلا خاموش اب کیسے رہیں گے لوگ سارے
زباں احساس کو میں اب عطا کرنے لگا ہوں
ہمارا ذہن ہے جو اب بھی خوگر مصلحت کا
مگر میں دل کو اپنا رہنما کرنے لگا ہوں
مجھے انصاف کی امید ہے اپنے خدا سے
میں دشمن کے لیے بھی اب دعا کرنے لگا ہوں
عدالت میں ہی مارا جاؤں گا جبرانؔ میں بھی
کہ میں سقراط ہوں سچ سے وفا کرنے لگا ہوں

غزل

اُس کے کانوں میں جو بالی ہوتی ہے
اُس نے میری جان نکالی ہوتی ہے

آنکھوں میں تو اُس کے کاجل ہوتا ہے
اور ہونٹوں پہ اُس کے لالی ہوتی ہے

اُس کی باتیں سُننے والی ہوتی ہیں
اُس کی صورت دیکھنے والی ہوتی ہے

سیر کو آؤ میرے دل کے گلشن میں
یہاں کی تو ہر چیز مثالی ہوتی ہے

پیار پتنگے جلتے ہیں مر جاتے ہیں
دل والوں کی ذات جلالی ہوتی ہے

تیرے جیسا ہیرا ملنا مشکل ہے
عاشق نے ہر کان کھنگالی ہوتی ہے

وحید ناز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

شام تو ہم نے کر لی مگر
تجھ بن کیوں کر ہو گی سحر

غزل

مرے پیارے خدا اتنی رعایت کر
فقط اک شخص مانگا ہے عنایت کر

بہت اغیار کی سنتا ہے اے منصف
کبھی فریاد میری بھی سماعت کر

تو اپنے جھوٹ کو بھی معتبر کر لے
مری سچی کہانی کو حکایت کر

مرا مسلک مرا فرقہ اداسی ہے
دلِ وحشی کسی دکھ کی تلاوت کر

ترے بس میں کہاں ترکِ روایت ہے
قبیلے کے بزرگوں کی اطاعت کر

مرا حصہ ہڑپ کر وہ یہ کہتا ہے
خدا کا شکر ادا کر تو قناعت کر

مری منزل فراز دار ہے احمد
تجھے کس نے کہا میری حمایت کر

احمد محسود

غزل

سگنل پر چالیس وہ لمحے برسوں ہم کو یاد رہے
گجرے والا بولا تھا جب، صاحب !! جوڑی شاد رہے

چوراہے پر یاد ہے کیسے دیتا تھا مجذوب دعا
تیرے گھر کا چولہا چوکھا صدیوں تک آباد رہے

عقل و دانش، فہم، فراست، ایک نظر میں ڈھیر ہوئے
اُن کی پلکیں اُٹھنے تک بس، ہم اُن کے استاد رہے

شب کی ہر سلوٹ سے پوچھو کیسے جاگے چاند اور میں
سُونی رات کے اک بستر پر کیسے دو افراد رہے

پریم نگر میں گارے مٹی سے بھی گھر بن جاتے ہیں
بنیادوں میں سچ کی پختہ اینٹیں ہوں بس یاد رہے

خود پر اسمِ اعظم پڑھ کے خود کو ہی تسخیر کریں
کب تک اِس آسیب نگر میں تنہا یہ ہمزاد رہے

عاطف جاوید عاطف

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ناقدوں نے مجھے پرکھا خالد
خاک صحراؤں نے چھانی میری

غزل

یوں مرا بننا سنورنا بھی گوارا ہے اسے
پھر مرا جاں سے گزرنا بھی گوارا ہے اسے

دور اندیش ہے کیسے مری خواہش رکھے
عام سی راہ سے ڈرنا بھی گوارا ہے اسے

جو خدا لگتی کہوں پیار بھی کرتا ہے مگر
ٹوٹ کر میرا بکھرنا بھی گوارا ہے اسے

ذہن اور دل میں سدا رہتی ہے کھینچا تانی
دل کا اصرار نہ کرنا بھی گوارا ہے اسے

اس کی چاہت میں مری جان چلی بھی جائے
اس طرح سے مرا مرنا بھی گوارا ہے اسے

رخسانہ سمن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دودھ کی نہریں ، خون کی لہریں
فرش پہ ہم نے عرش اتارا

غزل

اک نظر سرسری چراغوں پر
روشنی دھر گئی چراغوں پر

یہ بھی ممکن ہے کھل نہ پائے اب
اپنی یہ بے گھری چراغوں پر

اب تو اک ساتھ دیکھ لیتا ہوں
آگ اور آگہی چراغوں پر

روشنی سے الجھ رہے ہیں کئی
غور کر آخری چراغوں پر

زندگی موت کے گلے لگ کر
رقص کرتی رہی چراغوں پر

رات کے حسن پر دلالت ہے
شام کی دلکشی چراغوں پر

کیسے ممکن ہے بھانپ لے کوئی
دل کی موجودگی چراغوں پر

روشنی گفتگو میں در آئی
گفتگو جب چھڑی چراغوں پر

رات بھر کوئی پڑھتا رہتا تھا
عکسِ خوش چہرگی چراغوں پر

محمد علی ایاز

غزل

ناصحوں میں عجیب ہے اَن بَن
واعظوں میں عجیب ہے اَن بَن

ساتھ بیٹھے ہیں اور ساتھ نہیں
دوستوں میں عجیب ہے اَن بَن

سوگواری کو بھی یہ الجھن ہے
وحشتوں میں عجیب ہے اَن بَن

اَن سنی سی پکار منزل کی
راستوں میں عجیب ہے اَن بَن

حوصلے ٹوٹنے نہ پائیں بس
ڈوریوں میں عجیب ہے اَن بَن

پانیوں کی بغاوتوں کا خوف
ساحلوں میں عجیب ہے اَن بَن

راج ہے اب غنیم کا ہی یہاں
رہبروں میں عجیب ہے اَن بَن

لبنیٰ مقبول غنیم

غزلیں

غزل در غزل جو کہی جا رہی ہے
اذیت مسلسل سہی جا رہی ہے

ریاست بنی تھی مدینہ کی خاطر
بنامِ مدینہ لٹی جا رہی ہے

بنا کر بھکاری سیاسی لٹیرے
کہیں گے، ارے! بے بسی جا رہی ہے

غریبوں کو بہلانے کے واسطے پھر
حکایت نئی اِک گھڑی جا رہی ہے

حسین و حسن پر ستم جب سے ٹوٹا
صدی جو بھی ہے ماتمی جا رہی ہے

نفیس فاروق

یہ ہجر تو کب برپا قیامت نہیں کرتا
لیکن میں کبھی تجھ سے شکایت نہیں کرتا

قرطاس کو میں اپنا الم سونپ دوں کیسے
کیا لفظ مرے دُکھ کی وضاحت نہیں کرتا

انصاف نہیں اس کو ملا ہو گا مسلسل
یوں ہی کوئی توہینِ عدالت نہیں کرتا

ہے مسئلہ ایسا کہ ہر اِک اہلِ سیاست
توہین تو کرتا ہے، سیاست نہیں کرتا

ظالم کی مدد کو تو نکلتے ہیں ہزاروں
مظلوم کی کوئی بھی حمایت نہیں کرتا

جو لوگ سکوں اوڑھ کے سوئے ہیں سمجھ لیں
مٹ جاتا ہے، جو شخص ریاضت نہیں کرتا

غزلیں

زندگی بھر خزاؤں میں رہنا
کس لیے بے وفاؤں میں رہنا

جا رہا ہوں ترے نگر سے، مجھے
اب نہیں ان خداؤں میں رہنا

مار ڈالے گی غم کی ارزانی
کم کرو انتہاؤں میں رہنا

یہ غزل آخری سمجھ کے سنو
اور سیکھو بلاؤں میں رہنا

اچھا لگتا ہے ، ہر گھڑی ناصر
یوں کسی کی دعاؤں میں رہنا

معین ناصر

وہ سراپا رہا سہا اُس کا
منتظر ہو گا آئنہ اُس کا

عشق اُس نے کبھی کیا ہو گا
رکھ رکھاؤ بتا گیا اُس کا

اُس کا ملنا محال تھا ، یہ تو
خوشبوؤں نے دیا پتہ اُس کا

وہ کہانی عجب کہانی تھی
تن بدن سٹپٹا گیا اُس کا

اور پھر سوچنے لگا ناصر
کون در کھٹکھٹا گیا اُس کا

غزل

اسے کہو کہ ذرا دیر اور رک جائے
گھٹا سے ایک گزارش ہے، ابر برسائے

اسے کہو کہ ادھوری ہے بات ٹھہرے ابھی
اسے کہو کہ وہیں سے کہانی دھرائے

اسے کہو کہ بھرم ہے بھرم ہی رہنے دے
نبھانا کیا ہے تعلق کی بات رہ جائے

اسے کہو کہ وہ بھولے نہ گاؤں کے رستے
جو شہر چھوڑے تو گاؤں کو لوٹ کر آئے

اسے کہو کہ نہ الجھے مزید خوابوں سے
وہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے تو گھر پلٹ آئے

اسے کہو کہ جوانی تو شہر کو دے دی
بڑھاپا آئے تو وہ گاؤں لوٹ کر آئے

اسے کہو کہ مرا گاؤں دل کشادہ ہے
اسے کہو کہ نہ شرمائے، بے جھجک آئے

اسے کہو کہ میں سب کچھ بھلائے بیٹھا ہوں
وہ جانا چاہے تو بے شک خوشی خوشی جائے

اسے کہوں گا کسی روز جا کے میں طاہر
کہ اپنے خواب اٹھائے اٹھا کے لے جائے

طاہر مظفر ملک

غزلیں

سکوت جب بھی کسی شور میں بدلتا ہے
مہیب چپ میں کوئی سانحہ پنپتا ہے

حنائی ہاتھ کہاں پھر دعائی رہتے ہیں
انا کی کوکھ سے اک حادثہ نکلتا ہے

وفا شناس مروّت میں مارے جاتے ہیں
خمار ضبط کا رسوائیوں سے ڈرتا ہے

محل میں شاہ کے کیسے سکون آئے گا
جہاں غریب کی خواہش کا خوں نچڑتا ہے

سکونِ دل کو ترے آستاں پہ آتا ہوں
یہ دل ہے، دل پہ بھلا کس کا زور چلتا ہے

وہ کل تھا خوش جسے ساجد گرا کے نظروں سے
اسی سے ترکِ تعلق پہ ہاتھ ملتا ہے

سجاد حسین ساجد

جو دل کی شورشوں کا اب کے حساب کرتے
خود کو تباہ کرتے ، تجھ کو خراب کرتے

مجھ کو خدا جو دیتا تخلیق کا ہنر تو
دریا بناتے تجھ کو خود کو سراب کرتے

کیوں اب دکھائے مجھ کو مرکر جناب چہرہ
مجھ سے تھا پردہ ان کا، اب بھی حجاب کرتے

نامہ مرا گیا ہے گزرے ہیں اب کے برسوں
قسمت نہیں تھی میری حاصل جواب کرتے

دل کی گلی میں آ کر کرتے سوال ہم سے
ہم اُس سوال ہی کو، اُس کا جواب کرتے

جو رخ پہ اس کے پھیلا ہے چاندنی سا سایہ
مدت گزر گئی ہے، اس کو نقاب کرتے

آفتاب محمود شمس

غزلیں

تیرے چمن میں پھول ہیں میرے چمن میں آگ
تیرا شریر برف مرے تن بدن میں آگ

تیری جوانیاں گلِ تازہ کی ہم رکاب
میرے وطن کی دُلہنوں کے بانکپن میں آگ

تیری ہنسی میں نغمگی، نغموں کی جلترنگ
میرے لبوں پہ غم مرے سارے بدن میں آگ

تیرے بَوں میں سُرخ محبت کے ہیں گُلاب
ہر شے جلا رہی ہے مگر میرے بَن میں آگ

پھیلیں گے اُس کے شُعلے تری انجمن تلک
تُو نے کہ جو لگائی ہے میرے چمن میں آگ

شُعلہ بجاں تھے شُعلہ بجاں عمر بھر رہے
پالی ہے بچپنے سے بہت فکر و فن میں آگ

خارا مثال ہُوں، ہے جلانا زمیں کے ہاتھ
قائل رچی ہُوئی ہے مرے ہر سخن میں آگ

عمر قیاز قائل

اب نہ گزرے ہُوئے ماضی کو صدائیں دینا
اِس دبی آگ کو ہرگز نہ ہَوائیں دینا

نفرتیں بڑھ گئیں اِس تیری زمیں پر زیادہ
اے خُدا! میرے مجھے اور خَلائیں دینا

اُس کا ہے طرزِ تغافل تو دِل آزار بہت
کام اپنا ہے مگر اُس کو دُعائیں دینا

اے خُدا! اَگلے جنم پر ہے تمنّا میری
بے لباسی کو مرے اور قبائیں دینا

جانتا ہُوں کہ نہیں لوٹ کے آنے والا
میری عادت ہے اُسے پھر بھی صدائیں دینا

حرفِ دُشنام ہے مقسوم سدا سے اپنا
کار آسان نہیں ہم کو دُعائیں دینا

میں کہ قائل بھی تری ذات کا سائل بھی ہُوں
میرے رب بخش بھی سب میری خطائیں دینا

غزلیں

جب اپنی کھوج میں دو چار گام چلتے ہیں
ہم اس کے شہر کی گلیوں میں جا نکلتے ہیں

بوقت وصل جنھیں خامشی نے آن لیا
وہ لفظ آج بھی حسرت سے ہاتھ ملتے ہیں

یہ روشنی جو شبِ تار میں میسر ہے
بفیضِ ہجر مرے دل کے داغ جلتے ہیں

شجر گرا تو پرندے بھی مر نہ جائیں کہیں
وفا شعار کہاں آشیاں بدلتے ہیں

رہِ جنوں میں قمر ہم ہیں طفل کی مانند
سنبھل کے گرتے ہیں، گر کر بھی سنبھلتے ہیں

یہ کون جانے کہاں ہوں میں اور کہاں نہیں ہوں
جہاں نظر آ رہا ہوں اب کے وہاں نہیں ہوں

یہ تلخیاں تیری دان کردہ ہیں اے زمانے!
نہیں ہوں نادم اگر میں شیریں بیاں نہیں ہوں

میں اپنی ہستی میں جل رہا ہوں کہ بجھ چکا ہوں
ہوں راکھ میں یا کہ ایک شعلہ دھواں نہیں ہوں

یہ درد نالے یہ آہ و زاری شغف ہے اپنا
قمر کروں کیا کہ اب کے میں نغمہ خواں نہیں ہوں

دستگیر قمر

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

کیسی میٹھی مہک محبت تھی
شعر ، فنِ خطوط کاری ہے

غزلیں

ستم ہے یا کہ کرم اضطراب ہو کے رہا
عجیب روگ ہے زیرِ عتاب ہو کے رہا

وفا کی جنس ہے ناپید کچھ خیال رہے
چلن فریب کا تازہ نصاب ہو کے رہا

امید ٹوٹی ہوئی، خواب سر بریدہ ہیں
ہوائے ہجر میں خانہ خراب ہو کے رہا

متاعِ زیست سمجھ بیٹھا تھا اسے کھویا
عجیب سانحہ مجھ پر جناب! ہو کے رہا

سفر تھا شرط خدا تھا کہ ناخدا تہذیب
رضا سے جس کی ہمیشہ خراب ہو کے رہا

تہذیب حسین برچہ

تری میری محبت میں وفائیں اور باقی ہیں
کہا تھا ناں!! ابھی دل میں صدائیں اور باقی ہیں

جہاں بھر کے یہ غم جھیلے نصیبوں سے تری خاطر
خدا جانے ابھی کتنی سزائیں اور باقی ہیں

مری نظریں تری قسمت پہ جا ٹھہریں وہاں اب تو
چمن سے بس بہاروں کی فضائیں اور باقی ہیں

نجانے اس جدائی سے کبھی ہم ایک ہو پائیں
ہمارے پاس ورنہ یہ دعائیں اور باقی ہیں

ترے دکھ میں نجانے کب تلک بہتی رہیں حامی
مری آنکھوں میں اشکوں کی گھٹائیں اور باقی ہیں

نعمان حیدر حامی

غزل

زنداں سے نکل جانے کی تدبیر نکالے
ہر روز کوئی حلقۂ زنجیر نکالے

کوئی بھی جری مدِمقابل نہیں آیا
میں شہر میں پھرتا رہا شمشیر نکالے

ایسا نہ ہو گدی سے زباں کھینچ لی جائے
اب منہ سے کوئی شخص نہ تقریر نکالے

جب بھی مجھے پردیس نے لوٹا تو دعا کی
گھر سے نہ کسی شخص کو تقدیر نکالے

گر قیدِ مسلسل کی کہانی نہیں سنتا
آنچل سے ذرا زلفِ گرہ گیر نکالے

اِک عمر کی کوشش سے بھی ممکن نہیں نکلے
جو راہِ سخن میر تقی میر نکالے

ازور شیرازی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بیتِ دیوانِ غزل تھا خالد
یاد مجھ کو بھی تھا ، پھر بھول گیا

غزل

غمِ حیات کے ماروں کو زندگی بخشی
وجودِ عشق نے ذرے کو آگہی بخشی

لہو جگر کا جلایا تو کوئی بات بنی
پھر اُس کے بعد چراغوں نے روشنی بخشی

مرے وجود کے اندر بھی کوئی رہتا ہے
کسی کے پیار نے چہرے کو تازگی بخشی

مرے کریم کا احسان ہے بہت مجھ پر
مجھے شعور دیا اور شاعری بخشی

ہزار خواہشیں اک دل کو سونپ کر عنبر
جو ایک زندگی بخشی تو عارضی بخشی

فرحانہ عنبر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیکھا نہ ہمیں تُو نے خط و خال سے آگے
اک شہر تھا، اس شہرِ مہ و سال سے آگے

غزلیں

نین جن کے شراب کی صورت
ہونٹ اُن کے گلاب کی صورت

تو دھمکتا ہے ماہ و انجم میں
مثلِ لالہ شباب کی صورت

تیرے ہجر و فراق کے لمحے
مجھ پہ گزرے عذاب کی صورت

میری چاہت کے دل سمندر میں
تو ہے نایاب خواب کی صورت

تم محبت کی ہو غزل جاناں
کیوں نہ چھیڑوں رباب کی صورت

مصطفیٰ امغل

قصۂ غم وہ جب سنائے گا
ساری محفل کو ہی رُلائے گا

ہر قدم پر فریب دیتا ہے
ساتھ میرا وہ کیا نبھائے گا

میں تو عادی ہوں اِن حوادث کا
کب تلک مجھ کو آزمائے گا

بات سنتا نہیں بڑوں کی وہ
ٹھوکریں ہر قدم پہ کھائے گا

آج پھولے نہیں سماتا میں
آج ملنے وہ مجھ سے آئے گا

میں نہ ہوں گا نیاز دنیا میں
حال جب پوچھنے وہ آئے گا

نیاز خان اعوان

غزل

وفا شعار تھے ہم نے وفا کو عام کیا
کہ بے وفاؤں کا بھی دل سے احترام کیا

تمہاری چاہ نے کتنا عجیب کام کیا
مجھی سے چھین کے مجھ کو بس اپنے نام کیا

تمام عمر یونہی پرسکون بیت گئی
نہ خود ہوئے ہیں نہ ہم نے کسی کو رام کیا

لکھا جو لفظ بھی دل سے ترے لیے ہی لکھا
کہ تیرا ذکر ہی بس میں نے صبح و شام کیا

نہ جانے شہر میں کب آئے وہ چلے بھی گئے
عبث ہی ہم نے یہ اس درجہ اہتمام کیا

وہی ہیں لوگ جو چہرے بدل کے آئے ہیں
نظام بدلا انھوں نے نہ کوئی کام کیا

تمہارے وعدوں سے پھر دل بہل گیا ایسا
کہ اپنے خوابوں کو پھر سے تمہارے نام کیا

نائیلہ راٹھور

غزلیں

سب سے اونچی اڑان ہے میری
ہر پرندے میں جان ہے میری
آسماں سے گرا سمندر میں
آگے منزل گمان ہے میری
ایک دنیا کو رشک ہے مجھ پر
ساری دنیا ہی شان ہے میری
مری دنیا کو رشک ہے تجھ پر
تیری دنیا سے شان ہے میری
میں پرندوں کا پیڑ ہوتا تھا
سب سے میٹھی زبان ہے میری

جوق در جوق آ رہے ہیں لوگ
سب سے اونچی اذان ہے میری
نفرتیں آگ میں جلانی ہیں
راگ دیپک کی تان ہے میری
گھر ہواؤں میں اب بناؤں گا
اک تخیل چٹان ہے میری

سرفراز تبسم

اگرچہ پیاس پیالے میں پڑی ہے
مری کشتی سمندر سے بڑی ہے

اسے چھونا نہیں بس دیکھنا ہے
وہ لڑکی شکل سے اک پھلجھڑی ہے

اُسے ہر حال میں حاصل کروں گا
کہ خواہش آخری ضد پر اڑی ہے

سبھی کچھ جاننے کی کیا ضرورت
یہ دنیا کتنی مشکل میں پڑی ہے

فلک کس نے اُٹھا رکھا ہے سر پر
زمیں کی گھاس کیوں اتنی بڑی ہے

حقیقت میں نظر آئے کہیں تو
جو آئینے میں اک لڑکی کھڑی ہے

مرے تو ہاتھ بھی کاٹے گئے ہیں
ترے ہاتھوں میں تو بس ہتھکڑی ہے

غزل

اپنے ترکش میں لیے تیر کہاں تک پہنچی
میرے پیچھے مری تقدیر کہاں تک پہنچی

ترے غم نے مری خوشیوں کو عزادار کیا
دیکھ لو درد کی زنجیر کہاں تک پہنچی

ہم نے مانگا نہ دعاؤں میں کوئی تاج محل
چند سپنوں کی بھی تعبیر کہاں تک پہنچی

سارے اعمال پہ بھاری ہے مروت کا گنہ
لے کے مجھ کو یہی تقصیر کہاں تک پہنچی

کٹ گرا دل ترے پیغام کو پڑھتے پڑھتے
تو کہاں تھا تری شمشیر کہاں تک پہنچی

جس نے ہر درد مرے نام کیا ہے فیصل
وہ بتائے مری جاگیر کہاں تک پہنچی

فیصل زمان چشتی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کچھ جدائی کے دامن میں بھی چھوڑ دیں
ربط رکھیں ، اگر دوستی چھوڑ دیں

غزلیں

مانتی کب تھی یہ ہونے پر، مگر ہونا پڑا
راہ کی دیوار کو اس بار در ہونا پڑا

آ گیا تو بس خدا ہونے کا ہی گُر سیکھ کر
کل کلاں پھر آدمی تجھ کو اگر ہونا پڑا

بانٹ دی اپنی سمجھداری یہاں پر اس لیے
مجھ کو پاگل وقت سے کچھ پیشتر ہونا پڑا

آخرش تھا قیس کی گدی نشینی کا سوال
سو ہوا برباد مجھ کو جس قدر ہونا پڑا

گھر نہیں بس، کاش وہ بھی دیکھ لو اے حاسدو
عمر بھر اس کے عوض جو دربدر ہونا پڑا

مطمئن یوں تو رہا ہوں وقت کے انصاف پر
بس پریشاں درد کی تقسیم پر ہونا پڑا

عزم الحسنین عزمی

نئے قرینے نئی چال ڈھال دیتا ہوں
غزل کو روز نیا اک خیال دیتا ہوں

وہ حبس ہے کہ میں اکثر فقط لباس نہیں
بدن اُتار کے کھونٹی پہ ڈال دیتا ہوں

کبھی صدائیں مرے پاس رکھ کے جا ساری
میں ان سے سسکیاں چُن کر نکال دیتا ہوں

زمانوں بعد ملاقات ہے مری خود سے
تم آ رہے ہو تو پھر خود کو ٹال دیتا ہوں

سب اچھے وقت میں کر لوں نہ خرچ یار کہیں
کڑے دنوں کے لیے کچھ سنبھال دیتا ہوں

اسی لیے مجھے کہتے ہیں بحرِ ذوق یہاں
میں روز لعلِ سخن جو اچھال دیتا ہوں

غزل

الگ خمار ہے اس کا سبھی خماروں سے
جنوں کلام کرے کیوں خرد کے ماروں سے

ہمیشگی ترے عالم میں مل سکی نہ مجھے
نکل سکا نہ کبھی خوف کے مداروں سے

حصارِ ضبط میں رہنے دو آگہی کا نور
نکل نہ جائے کہیں روشنی کناروں سے

صفا کی اوٹ چھپایا ذُرِ گناہ بدن
غِنا کی روشنی پھوٹی ہے کالے غاروں سے

جھلکنے دیتی نہیں منزلِ مُراد مِری
عجیب دشمنی شب کو مرے ستاروں سے

جہانِ نُطق سے عُقدے نہیں کھلے میرے
خزاں کی باس ہی آئی ہے اِن بہاروں سے

ٹھٹھرتی رات لرزتی ہے چاند اوڑھے ہوئے
برہنگی نہیں ڈھپتی کئی سہاروں سے

ظفر چلو گلِ اشکاں ہی اَب تبرک لو
پلٹ رہے ہو اگر یاد کے مزاروں سے

یہ کس خیال سے گرتی ہیں پلکیں آنکھوں پر
کبھی تو جھانک مرے چاند ان چناروں سے

ظفر اقبال نادر

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

اے احتیاج یہ نمِ غم تاب اور ہے
سلکِ مژہ میں اک درِ ناب اور ہے

غزل

گُر محبت میں مجھے آتا نہیں تدبیر کا
اس لئے محبوس ہوں میں حلقۂ زنجیر کا

روز ہی ملنے کو کہتے ہو مگر آتے نہیں
سو یقیں مجھ کو نہیں ہے آپ کی تحریر کا

جو تجھے منظور ہے، مجھ کو وہی منظور ہے
ڈر مجھے کوئی نہیں ہے پیار کی تعزیر کا

لاکھ کوشش کر کے بھی خوش کر نہیں پایا ذرا
کچھ دوا درماں نہیں ہے اس دلِ دلگیر کا

خواب دیکھے تھے سُہانے ساتھ جینے کے مگر
تو نہ ہو تو کیا سُہانے خواب کی تعبیر کا

جو ترے خط کو کبھی مر کر بھی پڑھتا ہی نہیں
آسرا کاہے کو ہے اُس کی تجھے تصویر کا

اُس کی ہاں میں ہاں ملانا بھی سزا ٹھہری کڑی
اب شہاب اُس کو ستم ہی کیا تری تقدیر کا

شہاب اللہ شہاب

تلازماتی دروبست کی جمالیات کا شاعر

شاعرِ امروز

شہیر تہامی

شاہد ماکلی

شہیر تہامی کے ہاں فکر اور جذبہ کی آمیزش سے ایک ایسی شعری فضا وجود میں آئی ہے جس کی اسلوبی نیرنگی بھی دلفریب ہے اور حسیاتی پیکروں کے جمیل نقوش بھی ہماری قوتِ محسوس کو انگیخت کرتے ہیں۔ مصرع بہ مصرع جھلکتی ہوئی تلازماتی دروبست ان کے گہرے فنی اور لسانی شعور کا پتہ دیتی ہے۔ ان کی غزل میں نئے عہد کی نئی رمزیت انعکاس پذیر ہوتی ہے۔ وہ ایک عمدہ مصور کی طرح تناظر در تناظر رنگ آمیزی کرتے ہیں اور اپنے شعری کینوس پر ایسی تصاویر ابھارتے ہیں جو نہ صرف خاطر خواہ جاذبیت کی حامل ہیں بلکہ نئی معنوی جہات کی طرف بھی سمت نمائی کرتی ہیں۔ سب سے خوش آئند بات یہ ہے کہ ان کی غزل متنی و اسلوبی سطوح پر درجہ بہ درجہ ارتقا پذیری کی طرف مائل ہے۔

شہیر تہامی۔24 جولائی 1984ء کو کمالیہ میں پیدا ہوئے۔ غزل کے ساتھ ساتھ نظم بھی کہتے ہیں۔ ان کے غزلیہ اشعار کا انتخاب ایک سنجیدہ خوانش کا متقاضی ہے۔

میری مٹھی میں مرا آج نہ کل ہے صاحب
جانے پھر کس لیے بازو مرا شل ہے صاحب

جب بھی قامت پکڑنے لگتا ہوں
یار اندر سے ڈھے سا جاتا ہوں

جھیل میں چاند دیکھنے والو!
چاند پر جھیل دیکھنا ہو گی

مجھ سے اتنا بھی ہو نہیں پایا
تیرے جانے پہ رو نہیں پایا

گرچہ سر سے گزر گیا پانی
میرا مقصد ڈبو نہیں پایا

تم نے مجھ کو جہاں کھڑا دیکھا
میں وہاں پر رُکا تو تھا ہی نہیں

سینہ کوبی کروں کہ سر پیٹوں
تم نے رکھا نہیں کہیں کا مجھے

میری فطرت پہ حرف آتا ہے
داغ اچھا نہیں جبیں کا مجھے

اس لیے ہاں میں ہاں ملاتا ہوں
حوصلہ ہی نہیں ، نہیں کا مجھے

آنکھ بھر کر نہ دیکھیے مجھ کو
آنکھ بھر آئے گی مری ورنہ

بولنے ہی نہیں دیا اس نے
منہ میں ہی بات رہ گئی ، ورنہ . . .

راستہ راہ دیکھتا ہو گا
مجھ کو اذنِ سفر دیا جائے

نقطۂ انجماد پر بھی یہاں
زندگی دم بہ دم پگھلتی ہے

بس ذرا سی گرفت ڈھیلی کی
ہاتھ سے روشنی پھسلتی ہے

میں کہ جس دن نکل گیا خود سے
پھر یہ دنیا لکیر پیٹے گی

آگ پہلے پہل تھی میرے لیے
برف جیسی ہے آگہی اب تو

شہیر ، رنجِ فکاں سے نکلو
جو ہو گیا ہے سو ہو گیا ہے

یہ شہرِ حسن بھی جنگل کی حد میں آتا ہے
سو اعتبار جماؤ ، ڈسو ، نکلتے بنو

مرے یقیں پہ کوئی آنچ آنے والی نہیں
یہ عشق زار ہے اے وسوسو! نکلتے بنو

آگے کو پاؤں رکھوں تو پیچھے کو آ پڑے
ایسا طلسم پھونکا ہے ماضی نے حال پر

اچھا!! تو آپ سے بھی کوئی ہاتھ کر گیا
ہم دونوں یعنی ایک ہی زُمرے میں آ گئے

پھسلا تھا پاؤں خلد میں، دھرتی پہ آ رہا
چلتا ہوں اب زمیں پہ بڑی احتیاط سے

مجھ میں ٹھہراؤ کچھ زیادہ ہے
تُو بتا تیرا کیا ارادہ ہے

سگرٹوں کی یہ راکھ راکھ نہیں
یہ مری فکر کا بُرادہ ہے

یہ جو خاموشی گونجتی ہے شہیر
تیری آواز کا اعادہ ہے

سوچنا اور سوچتے رہنا.....
میں کھڑا ہوں اسی خسارے پر

خامشی بات ، بات خاموشی
ایک سی -- ان کہی ، کہی ، اب تو

آج اِس شہر میں اکیلا ہوں
کل یہ منسوب مجھ سے ہو بھی تو کیا

کب مَفَر ہے مجھے گزرنے سے
پہلے یہ راستہ گزر جائے

عشق میں مت اگر مگر کھیلیں
کھیلنا ہے تو جان پر کھیلیں

وقت کو سانپ سونگھ جاتا ہے
جب پرندے شجر شجر کھیلیں

کھیل سارا بگڑ گیا ہے شہیر
دل تو چاہے کہ عمر بھر کھیلیں

ایک سیٹی کی گونج خلیوں میں
سوچ اک لمس کی چھکا چھک پر

بے سبب اور بے یقیں ہونا
ایسا ہونا بھی ہے کہیں ہونا

میں کہ مشکل پسند ہوں یعنی
مجھ پہ آسان تم نہیں ہونا

آسماں گرچہ قد برابر ہے . .
کوئی خود سے نہ سر اُٹھائے تو؟

میری ہر سانس اُس کے نام شہیر
ہاں! مگر مجھ کو سانس آئے تو

کس نے دریا کو سامنے رکھا
کاغذی کشتیاں بناتے ہوئے

میرا اعزازیہ فقط یہ ہے
مجھ کو رہنے دو فاقہ مستی میں

میں نہیں دائرے میں رہنے کا
دائرہ تو فقیر کھینچتے ہیں

حضرت میر کا جو ٹھیلا تھا
اب جناب شہیر کھینچتے ہیں

بس میں ہو تو آگہی کی آگ میں
جھونک دوں اس کھوکھلی وا واہ کو

ایک لمحے کی بات تھی لیکن
ایک لمحہ بسر نہیں ہوتا

اک شرارت --- صدائے "آدم بُو"
بھوتنے بھی بشر بشر کھیلیں

روز تجدید کرنا پڑتی ہے
روز میں خود سے کیوں مُکرتا ہوں

پہلا قدم ہی اُلٹا پڑا تھا زمین پر
میرے ہی پاؤں میرے ہی رستے میں آ گئے

میں سہلِ ممتنع میں اُسے سوچتا رہا
مجھ پر جمالِ یار کی بندش نہ کھل سکی

کسی کی آنکھ میں آباد ہے جہاں سارا
کسی نظر میں یہ سارا جہان بھی کم ہے

☆☆☆☆☆

شعیب افضال کا پہلا شعری مجموعہ

شاعرِ امروز

شعیب افضال

شاہد ماکلی

شعیب افضال کی غزل کے لب ولہجہ کا اساسی جوہر، بین السطور جھلکتا جھلملاتا ہوا اُن کا وہ اعتماد ہے جو کسی گہرے روحانی تجربے اور مکاشفے سے نوریابی کے بعد ہاتھ آتا ہے اور جو اوّل اوّل آدمی کے ریشے ریشے میں نفوذ پذیر ہوتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ گفتار و کردار کا حصہ بن جاتا ہے۔ شعیب افضال کے فکری اجزا کا پھیلاؤ اور بکھراؤ مختلف جہات و اطراف کو محیط ہے۔ وہ مابعد جدید عہد کے تخلیق کار ہیں اور تخیلاتی سطح پر یونیورس کی آبنائے سے نکل کر ملٹی ورس کی طلسماتی بیکرانیوں میں آگے سے آگے محوِ سفر ہیں۔ وہ علمی، ادبی، اخلاقی اور عرفانیاتی سطح پر نہایت وسیع وژن کے حامل شخص اور شاعر ہیں۔ ان کے ہاں لفظ کے برتاؤ کا حسیّاتی ادراک اور اسمیّت کے مقابلے میں فعلیّت سے بھرپور کام لینے کا تخلیقی شعور حیرت انگیز ہے۔ وہ روایت سے کشید کردہ تازگی وتوانائی کو جب معاصر حسیت دانی سے پیوند کرتے ہیں تو ان کے نخلِ غزل پر مختلف معنوی ذائقوں اور رنگوں کے پھل پھول نمو یاب ہوتے نظر آتے ہیں۔

شعیب افضال کی غزل ذات، حیات اور کائنات کی تطبیق سے تشکیل پاتی معلوم ہوتی ہے۔ ذات کی اَسراریت تک رسائی اور پوشیدہ امکانات کو دریافت کرنے کی ان کی سعی وحدت الوجودی صوفیانہ طرز کے زیادہ قریب ہے۔ جبکہ وہ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی حیات کی جمالیات اوراس کے غیر جمالیاتی رخ کو ایک عام آدمی کی طرح دیکھتے اور بسر کرتے ہیں۔ پھر ایک سچے شاعر کی طرح ان متنوع الجہات پہلوؤں کو اپنی تخلیقی گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں جو ان کے نزدیک کسی نہ کسی سطح پر ان کے ذہنی، روحانی، تخلیقی اور تفہیمی ارتقا میں معاون تفاعل کا کردار ادا کرنے کی بیش از بیش اہلیت رکھتے ہیں۔

کائناتی تناظرات کی بوقلمونیاں اور نیرنگیاں ان کے محرکاتِ شعری میں سے ایک اہم تر محرک کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کی سیرِ آفاقی ان

کی سیر انفسی کے برعکس معلوم ہوتی ہے۔ ان کی سیر آفاقی کا غالب اسلوب ایک صوفی کے طرزِ مشاہدہ کے بجائے ان کے کونیاتی اور سائنسی شعور کی جمالیات سے پھوٹنے والے فسفیانہ انداز سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ لامتناہی کائناتوں کے انکشافی مشاہدات جب شعیب افضال کے حیطۂ تحریر میں آتے ہیں تو کہیں استعجابیہ روپ اختیار کر لیتے ہیں اور کہیں استفہامیہ رنگ میں تجسیم پاتے ہیں۔ شعیب افضال کی غزل اسی استعجاب اور استفہام کے مابین پھیلی ہوئی حیرتوں کے حسن کو سمیٹنے کی سعی کا نام ہے۔ ان کی سعیِ باریاب کے امکانی آثار اُن کے نقشِ اوّل کے صفحات میں جا بہ جا دیکھے جا سکتے ہیں۔

میں گر رہا تھا مسلسل کہ پر کھلے میرے
پھر اک جھپاک سے راکب ہُوا میں صرصر کا

نور کے ہالوں میں پھرتا تھا وہاں مَیں رات بھر
منتہا کی موج پر شک سا ہُوا آغاز کا

کواکب کو زمانوں میں فنا ہوتے بھی دیکھا ہے
مگر درگت ہماری جو تہِ افلاک بنتی ہے

میں خود کو ڈھونڈتا ہمگون کائناتوں میں
جدھر نگاہ کروں ، آپ ہی کو پاتا ہوں

قلبِ سلیم لا نہ سکا آپ کے حضور
کر لیجیے قبول مرا دل دُکھا ہوا

کچھ اور دیکھنے کا مجھے اشتیاق ہے
میرے نگاہ بان! تو کیا کیا دکھائے گا

وہ ایک لحظہ قیامت کا ہو زمیں زادو
اگر یہ سبز کرہ بے مدار ہو جائے

ساز پر ناچتے ہو بے سُتو
اپنے اندر کی بھی سنو گھوں گھوں

بدی کا پھل کبھی میٹھا ہوا، نہ ہووے گا
جسے یقین نہ آوے، وہ شوق فرما لے

مارخوروں کے مُڑے سینگوں سی پیچ و تاب میں
گھومتی ہے یہ زمیں آفاق میں لپٹی ہوئی

آسمانوں سے عناصر کی برستی بارشیں
چپچپاتی دلدلوں میں زندگی کی کیمیا

اپنی تدبیر میں لچک رکھنا
اس کا ہر فیصلہ اٹل ہو گا

نگاہ گرتی پھسلتی رہی ڈھلانوں پر
کہاں کہاں سے اٹھائیں، کہاں کہاں رکھیں

یہیں سے جاترا کرتا ہوں اِن جہانوں کی
سویدِ جاں میں جو اک آبنائے رکھتا ہوں

سکوتِ دہر سے ڈرتا دھمال کرتا ہوا
میں گھوم گھوم کے منظر گھمائے رکھتا ہوں

☆☆☆☆☆

'بوئی' والا بابا

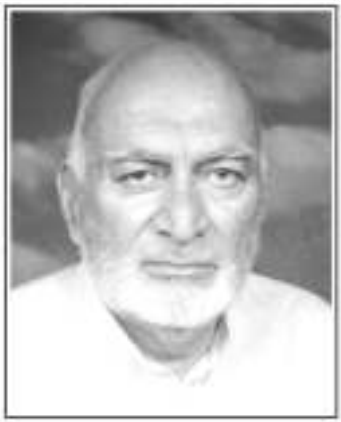

سطح سمندر سے تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار فٹ بلند سیاحتی مقام 'ٹھنڈیانی' کے پہلو سے بل کھا کر بائیں طرف 'بوئی' جانے والی سڑک بارش کی مہین بوندوں میں نہائی ہوئی تھی۔ دیودار کے پیڑوں کی چاروں اور پھیلی ہوئی خوشبو سندھ کے صحراؤں سے ابھرتی، 'مائی بھاگی' کی آواز کے ساتھ مل کر سارے ماحول کو پراسرار بنا رہی تھی۔ تپتی دوپہر جو تھوڑی دیر پہلے تک اِدھر اُدھر سے ہم پر آوازے کس رہی تھی، دور پیر پنجال کے پہاڑوں پر پڑی برف دیکھ کر ایسی خجل ہوئی کہ اس نے اپنی جون ہی بدل لی اور اب سرمئی چادر میں لپٹی پھوار میں بھیگ رہی تھی اور اس کی اِس ادا پر سارا جنگل دھمال ڈال رہا تھا۔ ہم پانچوں سوار ایبٹ آباد سے چلے تھے اور ہمیں 'بوئی' جانا تھا جہاں آج اپنی نوعیت کی ایک منفرد ادبی تقریب منعقد ہونے والی تھی اور وہاں آصف ثاقب یعنی 'بوئی والا بابا' ہمارا انتظار کر رہے تھے، آصف ثاقب کو 'بوئی والا بابا' پہلی بار میرے بچوں نے کہا تھا، اب ایک دنیا انھیں اسی نام سے جانتی ہے۔

والی مظفر آباد سلطان مظفر خان، سکھوں کے خلاف جنگیں لڑنے والے سلطان زبردست خان، قائدِ اعظمؒ کے معتمد ساتھی سلطان حسن علی خان کے خانوادے میں جنم لینے والے محمد آصف خان جنھیں ادبی دنیا میں آصف ثاقب کے نام سے جانا جاتا ہے اپنے والد سلطان عبدالقیوم خان کی وفات کے بعد ایبٹ آباد سے اپنے آبائی قصبے 'بوئی' منتقل ہوگئے تھے کہ باپ کی دستار اب ان کے سر پر رکھی جا چکی تھی۔ اس خاندان نے سید احمد شاہ اور سید اسماعیل شاہ کا بھرپور ساتھ دیا تھا، تحریکِ پاکستان میں قائداعظم محمد علی جناح کی آواز پر لبیک کہا تھا اور 1947 کی جنگِ آزادی کشمیر میں ہراول دستے کی قیادت کی تھی۔ آصف

احمد حسین مجاہد

ثاقب ملک کے معروف شاعر، ادیب اور ماہر علم عروض ہیں۔ آپ کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور کئی مسودے اشاعت کے منتظر ہیں۔ مجھے یہ سعادت حاصل ہوئی کہ اکادمی ادبیات پاکستان نے، پاکستانی ادب کے معمار کے سلسلے میں آصف ثاقب کی شخصیت اور فن پر کتاب لکھنے کا کام مجھے تفویض کیا اور یہ کتاب اپریل 2021 میں اکادمی کے چیئرمین یوسف خشک صاحب کی ذاتی توجہ اور اختر رضا سلیمی کی نگرانی میں اشاعت پزیر ہوئی۔ بوئی میں ہونے والی اس تقریب کا پہلا دور اسی کتاب کی رونمائی کے حوالے سے تھا۔ دوسرے دور میں ہزارہ اور کشمیر کی مختلف تنظیموں نے انھیں خراج تحسین پیش کرنا تھا۔

طلوع ادب (باغ، آزاد کشمیر) کے شاعر دوست شفیق راجہ، شہباز گردیزی، دلشاد اریب اور زبیر حسن زبیری گرمیوں کے آدھے دن کی مسافت طے کر کے گڑھی حبیب اللہ پہنچ چکے تھے اور وہاں دریائے کنہار کے کنارے کشمیر لٹریری فورم (مظفر آباد) کے دوستوں احمد عطا اللہ، یامین اور ایاز عباسی کے ہمراہ گڑھی کا مشہور کباب کھانے میں مصروف تھے۔ اعجاز نعمانی، فرہاد احمد فگار، ارشد شیزی، حب محمد اور نعمان سلیم بھی مظفر آباد سے نکل پڑے تھے۔ بزم علم و فن (ہزارہ) کے صدر واحد سراج اور جنرل سیکرٹری ڈاکٹر عامر سہیل سے رابطہ ہوا تو پتا چلا کہ بوئی پہنچنے ہی والے ہیں۔ حلقۂ یاراں (شنکیاری) سے وابستہ شاعر دوست محمد حنیف اور تاج الدین تاج بٹراسی کی بھول بھلیاں میں کھوئے ہوئے تھے جب کہ رستم نامی اپنی علالت اور سائبان سخن دوست کے روح ورواں صاحب زادہ جواد الفیضی اپنی مصروفیت کی وجہ سے ان کے ہمراہ نہیں آ پائے تھے۔ سلطان سکون، عبدالوحید بسمل (2ws)، عادل سعید قریشی (قلم کلام)، قاضی ناصر بخت یار (سرپرست بزم اہل سخن) اور 'آپڑیں ہندکو' کے منتظم سہیل احمد صمیم 'ہندکو ماہیے' گاتے منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ 'نیا اسلوب' سے منسلک دوست محمد امتیاز الحق امتیاز، حنیف دیپ، ضیا شاہد اور سعید ناز فاریسٹ چیک پوسٹ کے قریب کسی ہوٹل میں شکم کی آگ بجھا رہے تھے۔ نیا اسلوب کے صدر ڈاکٹر ضیا الرشید اپنے مریضوں کو چھوڑ کر کیسے آ سکتے تھے، ان دوستوں کی کمی محسوس ہوئی۔

اچانک امان اللہ خان امان نے گاڑی کی رفتار کم کر دی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے انھیں دیکھا تو بولے کہ احمد ریاض، خرم شاہ اور قمر زمان کو چائے کی طلب ہو رہی ہے اور مجھے سگریٹ کی۔ گاڑی ایک چھوٹے سے ہوٹل کے سامنے رک چکی تھی، ہم چائے

پینے اترے مگر تنور پر روٹیاں لگانے والے شخص نے یہ کہہ کر ہمیں مایوس کر دیا کہ آج گاؤں میں شادی ہے اور مجھے ایک بجے سے پہلے انھیں روٹیاں دینی ہیں۔ گاڑی پھر چل پڑی اور اس بار اُس حویلی کے سامنے جا کر رکی جس کے در و دیوار سے آج بھی سلاطینِ بمبہ کی خوشبو آ رہی ہے۔ برآمدے میں کرسیاں اور چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں، جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ تقریب یہیں منعقد ہو گی۔ کمرے میں پڑی میزوں پر رکھے برتن بتا رہے تھے کہ یہاں چائے پی جائے گی۔ مشتاق احمد آزاد بھی اپنا کیمرا لیے آموجود ہوئے تھے۔

اتنے میں 'بوئی والا بابا' یعنی آصف ثاقب بھی تشریف لے آئے۔ تقریب کا آغاز ہوا تو ''بوئی'' کی فضائیں اللہ عزوجل کے مبارک کلام اور نعتِ نبیؐ سے گونجنے لگیں۔ نشیب میں بہتے دریائے کنہار کے اس طرف پہاڑ کے عقب میں مظفر آباد کا شہر ہے جو آزاد کشمیر کا دارالحکومت بھی ہے اور ایک بڑا ادبی مرکز بھی۔ اس پرانی حویلی کے قریب ہی **1906** میں قائم ہونے والا پرائمری سکول، مسجد اور وہ شہر خموشاں ہے جہاں اپنے وقت کے سلطان ابدی نیند سو رہے ہیں۔ ان بزرگوں کا بار بار ذکر ہوا، مجھے لگا جیسے ان بزرگوں کی روحیں آصف ثاقب سے خوش ہیں، جن کی وجہ سے آج بوئی میں ان کے خاندان کو ہدیہ تحسین پیش کرنے والے جمع ہیں۔ میں نے آصف ثاقب کی طرف دیکھا، علم و ادب کا یہ روشن مینار، یہ درویش، یہ شاعر اب چھیاسی سال کا ہو گیا ہے۔ ساری عمر لکھتے پڑھتے گزار دی۔ عروضی مباحثوں میں ایسے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کہ علی عباس جلال پوری، جابر علی سید اور احمد ندیم قاسمی جیسے مشاہیر نے آپ کو ماہرِ علمِ عروض قرار دیا۔ آصف ثاقب کو دیکھ رہا تھا اور مجھے آپ ہی کا ایک شعر یاد آ رہا تھا:

میری پہچان یہی ہے ثاقب
مجھ کو دیکھو تو خدا یاد آئے

.....

پہلے دور کی صدارت امان اللہ خان امان نے کی، مہمان خصوصی احمد عطا اللہ تھے، ڈاکٹر عامر سہیل نے پہلے دور کی نظامت کی۔ امتیاز الحق امتیاز نے کتاب، کتاب کے مصنف اور آصف ثاقب کے حوالے سے اپنا مضمون پیش کیا جسے بہت سراہا گیا۔ امتیاز الحق امتیاز نے مختصر سے مضمون میں وہ سب کچھ کہہ دیا جس کے لیے پورے ایک دفتر کی ضرورت تھی۔ مجھے بھی کچھ کہنے کا موقع دیا گیا مگر میں کیا کہتا، بس ان کا ذکر کیا جن کی وجہ سے یہ کتاب شائع ہوئی ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان اس کے چیئرمین ڈاکٹر یوسف خشک صاحب اور اختر رضا سلیمی کا تو سبھی نے ذکر کیا، سبھی نے ان کی خدمات پر

انھیں خراجِ تحسین پیش کیا۔ مہمانِ خصوصی احمد عطااللہ اور صدرِ محفل امان اللہ خان امان نے اپنے اپنے مخصوص انداز میں کتاب پر روشنی ڈالی۔ دوسرے دور کی صدارت واحد سراج نے کی جب کہ مہمانِ خصوصی باغ سے آنے والے شاعر اور ادیب شفیق راجہ تھے۔ اس دور کی نظامت اعجاز نعمانی کے ذمے تھی۔ نظم کے بڑے شاعر یامین نے مضمون پڑھا اور سماں باندھ دیا۔ سلطان سکون، اعجاز نعمانی، ایاز عباسی، احمد ریاض نے آصف ثاقب کو منظوم خراجِ تحسین پیش کیا۔ احمد عطا اللہ نے آصف ثاقب کو 'دبستانِ ہزارہ و کشمیر کا سلطان' کا لقب دینے کی قرارداد پیش کی، جس کا شرکائے محفل نے ہاتھ اُٹھا کر مہر تصدیق ثبت کی۔ واحد سراج نے اس تقریب میں ہزارہ اور کشمیر کی نمائندہ ادبی تنظیموں میں شرکت کو ان بزرگوں کا فیض قرار دیا، جن میں سے کچھ تو اس تقریب میں شریک تھے اور کچھ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے ہیں۔ آصف ثاقب نے گفتگو کرتے ہوئے اکادمی سے لے کر محفل میں موجود ہر شخص کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ بوئی میں منعقد ہونے والی یہ پہلی ادبی تقریب ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتاب (آصف ثاقب، شخصیت و فن) میری ساری زندگی کا حاصل ہے اور اس کتاب کو لکھتے ہوئے احمد حسین مجاہد نے اپنا کلیجہ نکال کر کاغذ پر رکھ دیا ہے۔ ان کے یہ الفاظ میرے لیے کیا معنی رکھتے ہیں یہ کوئی مجھ سے پوچھے۔ تقریب کے اس دور میں آصف ثاقب نے کیک کاٹا۔ ادبی تنظیموں کے نمائندوں نے انھیں تحائف اور اسنادِ اعتراف و تحسین پیش کیں۔ چائے کیا تھی، ''بوئی والا بابا' کے بچوں نے مہمانوں کی تواضع اسی انداز میں کی جو سلاطین کا خاصا رہا ہے۔ ایسی بابرکت تقریب دیکھی نہ تھی۔ آصف ثاقب کے چھوٹے بھائی جاوید قیوم خان بھی اس تقریب میں خصوصی طور پر شریک ہوئے۔ بوئی میں شام اتری تو ملک کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے قافلوں نے اپنی اپنی راہ لی۔ ہم ٹھنڈیانی سے ذرا نیچے کنڈ کے مقام پر پہنچے تو 'نیا اسلوب' کے دوست ٹھنڈے موسم میں چائے کی بھاپ اڑاتے دکھائی دیئے، ہم بھی وہیں بیٹھ گئے اور اچھا خاصا مشاعرہ برپا کر دیا۔ کنڈ والوں نے ایسا منظر پہلے کب دیکھا تھا، سارے اکٹھے ہو گئے اور خاموشی سے ہمیں واہ واہ کرتے دیکھتے رہے۔ وہاں سے نکلے تو منظر ماند پڑ چکے تھے لیکن ایک روشنی تھی جو ہمارے اور اندر اور باہر ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، مجھے احمد مشتاق کا شعر یاد آ گیا:

ماند پڑتے ہوئے منظروں کی قسم
واپسی کے سفر کا مزا اور ہے

☆☆☆☆☆

خوشامد کے کرشمے

زندگی کو پانی کا بلبلہ سمجھنے والے بھی جب اس کے مشکلات اور سختیوں کا سامنا کرتے ہیں تو چیخ اٹھتے ہیں - شاعر محترم تو ایسی ہی صورت حال دیکھ کر پکار اٹھے تھے۔

جس دور میں جینا مشکل ہو
اس دور میں جینا لازم ہے

.....

مگر اب ہر کوئی اتنی ہمت و حوصلے کا مالک بھلا کہاں ہو سکتا ہے - وہ تو شکر ہے کہ ہمارے کچھ ذہین و فطین کرم فرماؤں نے چند ایسے اصول و قواعد ایجاد کر لئے ہیں جن کو کام میں لا کر جینے کو اگر پورے طور پر نہیں تو تھوڑا بہت ہی آسان بنایا جا سکتا ہے - چاپلوسی، خوشامد، جھوٹ وغیرہ کو اس فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے-

دھونس، دھاندلی اور دو نمبر طریقے سے کام نکالنا تو کوئی یاری خان سے سیکھے؛ اتنی مہارت اور استادی سے مخاطب کو شیشے میں اتار لیتے ہیں کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں اور اسی صفت کو بنیاد بنا کر میں نے ان کے نام کے ساتھ استاد کا سابقہ بھی نتھی کر دیا ہے یعنی استاد یاری خان - واقعی وہ ناممکن کو ممکن بنانے اور انہونی کو ہونی کر ڈالنے کے ماہر اور استاد تھے اور آج بھی استاد یاری خان اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ میرے سامنے میرے ہی گھر میں موجود تھے- میرے لٹکے ہوئے منہ کو نظر انداز کرتے ہوئے بولے -" تمہیں کالے کو سفید کہنے کا ہنر ابھی تک نہیں آیا؛ خوشامد کے ذریعے بڑے بڑے سورماؤں کا رعب صابن کی جھاگ کی طرح فوراً بیٹھ جاتا ہے- خوشامد ایک ایسا زہر ہے جسے ہم قند بنا کر سامنے والے کے کانوں میں انڈیل دیتے ہیں- اس ہتھیار کے سامنے کسی کی ایک نہیں چلنے والی ہوتی -"

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

نور کمال شاہ

خوشامد کی دام میں گھیر لینے کے بعد آپ کسی سے کچھ بھی کروا سکتے ہیں؛ آزمائش شرط ہے"۔

میں نے فوراً ہی سوال کر ڈالا ، "تو کیا ایسا کر کے ہم غلط نہیں کر رہے ہوتے؟ میرے خیال میں تو یہ سراسر ناجائز ہے، کھلم کھلا دھوکا ہے"۔

بولے "دھوکہ کیسے؟ علامہ اقبال جیسے بڑے شاعر کہہ گئے ہیں،

کر تو بھی مملکت کے وزیروں کی خوشامد
دستور نیا اور نئے دور کا آغاز

.....

ہم خوشامد کر کے کسی کو دھوکہ نہیں دیتے میری جان! البتہ اسے اس کے مقام سے ذرا اونچا کر کے اسی کے سامنے پیش کر دیتے ہیں؛ اس طرح سے اس کی خوشی و تسکین کا سامان بھی ہو جاتا ہے اور ہمارا کام بھی نکل جاتا ہے۔ غموں اور پریشانیوں کی اس دنیا میں کیا کسی کو لمحہ بھر کی خوشی اور اطمینان دینا بری بات ہے؟ میرے خیال میں تو یہ نیکی کا کام ہے "۔

"تو پھر خوشامد کو بری بلا کیوں کہا گیا؟" میں نے پوچھا تو فوراً" جواب دیا۔

"ایسا کہنے والے نادان ہیں؛ وہ خوشامد کے کرامات سے ناواقفیت کی بناء پر ایسا کہہ رہے ہیں وگرنہ اس کے کمالات پر وہ خود بھی یقین رکھتے ہیں۔ کیا جھوٹ کو تمام برائیوں کی جڑ سمجھنے والے خود کبھی جھوٹ نہیں بولتے؟ بولتے ہیں جناب اور دل کھول کے بولتے ہیں، بس موقع اور حالات کا فرق رہتا ہے۔ اسی طرح خوشامد کے خلاف جھوٹ موٹ کی مہم چلانے والے موقع ملتے ہی اس بہتی گنگا میں ہاتھ ضرور دھوتے ہیں۔"

"تو کیا یہ خوشامد کا ہتھیار ہر جگہ کام دکھاتا ہے؛ میرا مطلب ہے ہر قسم کے آدمی کو اس کے استعمال سے قابو کیا جا سکتا ہے "۔ میں نے سوال داغا تو وہ مسکرا کر بولے۔

"جی ہاں بالکل؛ بس ذرا سا تکنیک بدلنا پڑتا ہے۔ دیکھو! ہم سب خوشامد کے بھوکے ہیں۔ اپنی تعریف سننا ہر کوئی پسند کرتا ہے، خواہ وہ تعریف جھوٹ موٹ کی ہو یا حقیقی۔ ہم دوسروں کی زبان سے وہ سننا چاہتے ہیں جو باوجود کوشش کے اور کڑی محنت کے؛ ہم ابھی تک نہیں سن پائے اور جس کے سننے کے ہم برسوں سے مشتاق ہوتے ہیں بلکہ اکثر ہم ان ہی تعریفی کلمات کو سننے کے منتظر بھی رہتے ہیں "۔

" تو کیا یہ خوبیاں موروثی ہوتی ہیں؟ میرا مطلب ہے کسی کی جھوٹی موٹی تعریف کرنے کی؟"۔ میں نے پوچھا تو جواباً" عرض کیا۔

"ہاں! ہونی تو چاہئیں؛ کیونکہ اکبر الہ آبادی مرحوم نے کہا تھا:

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
تو پسر وارث میراث پدر کیوں کر ہو

.....

مگر اکثر یہ علم اکتسابی ہی ہوتا ہے اور اپنی ذہانت، دانائی اور چالاکی سے بآسانی اسے سیکھا جا سکتا ہے، اگر انسان کے اندر تھوڑا سا شرارت اور بگاڑ کا مادہ موجود ہو تو وہ اس فن میں کمال تک پہنچ سکتا ہے۔"

اور واقعی استاد یاری خان کے ضمن میں یہ صرف کہنے کی حد تک نہیں تھا بلکہ ایک عریاں حقیقت تھی کہ وہ لمحوں کے حساب سے سامنے والے کو زیر کر لیتے تھے۔ کئی موقعوں پر میں خود اس کا چشم دید گواہ بھی رہ چکا ہوں۔ بہت دفعہ تو میرے ہی کسی کام کے سلسلے میں انہیں اپنے ہمراہ لے جا کر تماشہ دیکھ چکا ہوں۔ ہر جگہ اور ہر موقعے پر ان کا طریقہ واردات مختلف ہوتا ہے۔ اور وہ اکثر ہی کامیاب و کامران لوٹے ہیں۔ مثلاً" ایک دفتر میں واجبی شکل و صورت والے ایک صاحب کو دور سے پکارتے ہوئے کہنے لگے، "ابا! آغا صاحب، آج تو خوب چمک رہے ہیں ماشاء اللہ، دفتر کی شان بڑھا لی ہے آپ نے، چشم بددور۔" ایک کمزور قابلیت رکھنے والے ناکام اور نالائق سے افسر کو مخاطب کر کے فرمانے لگے، "میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس محکمے میں ابھی آپ جیسے انتہائی قابل اور کام سے شوق رکھنے والے افسر موجود ہیں ورنہ سب کچھ چوپٹ ہو جاتا"۔ ایک بااختیار شخص کو نئے لباس میں ملبوس دیکھ کر فوراً بول اٹھے، "اخاہ؛ خواجہ صاحب قسم خدا کی آپ کپڑے میں نہیں، بلکہ کپڑے آپ پہ سج رہے ہیں؛ سبحان اللہ"؛ آپ کی وجاہت کے باعث کپڑوں کو رونق نصیب ہوئی ہے حضور"۔ ایک دوست جو کسی طور بھی جان نہیں چھوڑتے تھے؛ ان سے کام آن پڑا تو دور سے انہیں دیکھ کر مسکراتے ہوئے بول پڑے، "اوہو!! آج تو چاند صبح ہی صبح نکل آیا؛ زہے نصیب۔" ایک صاحب نے اطلاعی پیغام بھیجا، "میں کل ان شاء اللہ کراچی سے پشاور پہنچوں گا اور تین دن تک پشاور ہی میں موجود رہوں گا؛ احباب ملنے آ سکتے ہیں۔" ان سے کام پڑنے والا تھا اس لئے مناسب جواب کی ضرورت تھی چنانچہ جواباً" کہلا بھیجا، "پشاور شہر کی شائد قسمت کھل گئی ہے کہ آپ یہاں تشریف لا رہے ہیں، خوش آمدید، جی آیانوں۔" اسی طرح ایک رشوت خور اور بدعنوان پولیس افسر کو مخاطب کر کے کہنے لگے؛ "آپ کی ایمانداری اور فرض شناسی پر اکثر مجھے رشک آتا ہے، کاش کہ آپ جیسے چند بندے ہر محکمے میں ہوتے تو اس ملک کی تقدیر بدل

جاتی"۔

میرے استفسار پر وضاحت دیتے ہوئے فرمایا؛" دیکھو جانی! سچ سننا اور اسے ہضم کرنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ کوئی بھی فرد اپنے متعلق سچ سننے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ معمولی شکل وصورت والے شخص کو اگر میں حقیقتاً بتا دیتا کہ یار! تم ذرا بھی اچھے نہیں لگ رہے تو وہ میرا جینا حرام کر دیتا، نئے کپڑوں والے صاحب کو اگر میں سچ بتا دیتا کہ یہ کپڑے تم پہ بالکل نہیں جچ رہے؛ مسخرے لگ رہے ہو تم ان کپڑوں میں تو کیا وہ میرا سر نہ پھاڑ دیتا ؛ جو صاحب کراچی سے پشاور پہنچ رہے تھے ان کو اگر میں جتلا دیتا کہ تم پشاور صرف دعوتیں آڑانے آ رہے ہو؛ اور کوئی غرض نہیں تو وہ میرا جانی دشمن نہ بن جاتا۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا؛ بلکہ ان سب کے عزت نفس کا خیال رکھا اور ان سب کے ذریعے اپنے کام بھی نکلوائے۔"

اب گھر کی سنیے۔ ہماری بیگم کو استاد یاری خان زہر لگتے ہیں، خدا واسطے کا بیر رکھتی ہے وہ نیک بخت۔ اور ان کی وقت بے وقت آمد کو وہ ہماری نجی معاملات میں سراسر دخل اندازی سمجھتی ہیں۔ چنانچہ آج بھی ان کی آمد پر منہ بسور کر شدید ناگواری کا اظہار کر چکی تھیں۔ وہ موقعے کے انتظار میں رہتیں کہ کیسے ان کو یہاں سے جلد از جلد بے دخل کر دیا جائے۔ مگر وہ اتنی جلدی محاذ چھوڑ کر نکلنے والے انسان نہیں تھے۔ آج بھی باتوں کا کورس مکمل کرنے کے بعد ادھر ادھر جھانکنے لگے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کچھ کہنے یا کوئی فرمائش کرنے کے لئے پر تول رہے ہیں۔ بالآخر بول پڑے؛" دیکھو یار! برا نہ منانا مگر جب تک بھابی کی ہاتھ کی چائے نہ پی لوں؛ کسی بھی چیز کا مزہ ہی نہیں آتا۔ اور وہ شاندار چائے پیے بغیر ٹلوں گا بھی نہیں۔ خدا جانے اللہ تعالیٰ نے بھابی کی ہاتھ میں کتنی مٹھاس رکھی ہے۔ میں نے ہر جگہ اور ہر شہر کی چائے پی ہے مگر قسم خدا کی، جو ذائقہ بھابی کے ہاتھ میں اللہ نے رکھا ہے وہ کسی اور جگہ کہاں ؛ میں حیران اس بات ہوں کہ ایسی سگھڑ اور سمجھدار خاتون تم جیسے بے کار انسان کی قسمت میں کیونکر لکھ دی گئی۔ اچھا اس قصے کو جانے دیجئے ؛ بس آپ جلدی سے بھابی کی ہاتھ کی چائے پلوا دیں.....

اور آپ یقین کر لیں کہ ان کے رخصت ہونے سے پہلے پہلے شاندار چائے ڈرائینگ روم میں پہنچ چکی تھی ؛ نہ صرف چائے بلکہ ساتھ ہی دیگر بہت سارے لوازمات بھی؛ اور چائے بھی ایسی جس کے لئے میں خود کئی کئی وقت ترستا رہا ہوں.....!!!!!

☆☆☆☆☆

کرامت بخاری ___ غزل کی آبرو [خواب کو سچ میں ڈھالنے کی لگن]

خواب دیکھنے اور خواب ریزے جمع کرنے پر کوئی پابندی نہیں، خواب اور حقیقت امکان کی حد تک ایک دوسرے کا عکس جمال ہیں لیکن خواب ادھورے اور حقیقت مکمل اکائی ہے اور شاعر کی نگاہ میں یہ عالم حرف و صوت حقیقت سے بڑھ کر ایک خواب ہے جس کی تعبیر عہد مستقبل میں پیش کی جائے گی جب کہ ایک سخنور خواب ریزے یکجا کر کے اپنے قارئین کو ورطۂ حیرت میں ڈالنے کی آرزو رکھتا ہے اس وقت ہمارے سامنے ایک منفرد اور منتخب دیوانِ شاعری ہے جسے عہد موجود کے نامور شاعر کرامت بخاری کی تخلیقی ہنرمندی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، یہ سخن ریزے غزلوں کو نئی آب و تاب اور دیدہ وروں کے لیے ایک ایسی دستاویز ہے کہ انھیں اپنے جذبوں کی چکا چوند میں ابھرتے ہوئے خورشید جہاں تاب کی تپش محسوس ہو گی۔ قارئین کی بڑی تعداد ان کے اشعار میں اپنی آرزوؤں کی ناتمامی اور زندگی میں اپنے خواب ریزوں کی جلوہ سامانی کا مرقع دیکھ کر طمانیت سے ہم آغوش ہونا چاہتے ہیں۔

کرامت بخاری کا شمار خواص اور عوام دونوں میں ہوتا ہے، اپنے عہدۂ جلیلہ کی مناسبت کے پیش نظر وہ خواص میں نظر آتے ہیں جب کہ بحیثیت سخنور انھیں ہم عصر ہر سطح کے قلمکاروں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ عمر بھر لفظ ہی لکھے میں نے اور وہ لفظ کی قدر و قیمت کا حقیقی ادراک رکھتے ہیں، وہ

حسن عسکری کاظمی

حرفِ امید کو جلوہ بار دیکھنا چاہتے ہیں، ان کی تخلیقی ثروت مندی کا اعتراف کیا جا چکا ہے وہ خود بھی یہ کہہ چکے ہیں کہ:

لکھتا رہتا ہوں غم کی تحریریں
سطرِ جاں تک لہو لہو ہو گی
ہے کرامت مجھے یہ پختہ یقیں
میرے شعروں کی آبرو ہو گی

.....

وہ پختہ کار شاعروں میں سیف الدین سیف کو سرفہرست دیکھتے ہیں، جہاں ان کی صحبت میں کچھ وقت گزرا وہاں ان سے مشورۂ سخن میں رہنمائی حاصل کی اور غزل کا رنگ و آہنگ اور لفظوں کے دروبست میں ان کی ہدایت پر عمل کیا یہی وجہ ہے کہ اب کرامت بخاری پُر اعتماد لہجے میں غزل آغاز کرتے ہیں جیسے:

جس شجر پہ ثمر نہیں ہوتا
اس کو پتھر کا ڈر نہیں ہوتا
میکدے میں یہ ایک خوبی ہے
ناصحا تیرا ڈر نہیں ہوتا
آنکھ میں بھی چمک نہیں ہوتا
جب وہ پیشِ نظر نہیں ہوتا

.....

ان کے آنے کی آس رہتی ہے
ہر تمنا اداس رہتی ہے
تم مری تشنگی کو کیا جانو
تم سے مل کر بھی پیاس رہتی ہے

کرامت بخاری فلسفی یا مفکر نہیں وہ ایک سخنور، دانشور اور قبیلہ قلم کے باخبر فنکار ہیں مگر وہ فکر و نظر کی سرزمین پر قدم رکھنا اور تفہیم زندگی کا مرحلہ طے کرنا چاہتے ہیں، وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ زندگی کی حقیقت تک رسائی ملے لیکن وہ خود معترف ہیں کہ:

جب ہوائے سخن نے پر کھولے
زندگی رو رہی تھی سر کھولے
کچھ نہ پائے گا جز تحیّر کے
راز ہستی اگر بشر کھولے
وہ اگر ہے کہیں تو دے آواز
پھر رہا ہوں میں چشمِ تر کھولے

.....

کائنات سے متعلق سوچنا، انسان اور خالق کی ہستی کو زیر بحث لانا ایسے باشعور افراد انسانی کا شعار ہے جو عرفان و آگہی کے چشموں سے سیراب ہوتے ہیں۔ یہ کارِ ہنر سے بڑھ کر کارِ تخلیقیت ہے جسے ہر شخص انجام نہیں دے سکتا، اسی طرح ہر شاعر اس مقام تک نہیں پہنچ پاتا کہ وہ ایسے سربستہ راز سمجھ سکے، یہی وجہ ہے کہ غزل میں ایسے نکات کم بہت کم نظر آئیں گے جو عشق و سرمستی کی فضا میں دلِ دردمند کی بات سمجھنے اور اسے دوسروں تک پہنچانے کا ہنر جانتے ہوں۔ کرامت بخاری نے یہ تجربے کیے اور غزل میں ایسے موضوعات پر گفتگو کی ہے

جوان کی زندگی میں اعلیٰ مقصد کی ترسیل کا وسیلہ قرار پائے ہیں:

جس داستان کا مرکزی نکتہ ہے کائنات
اس داستاں کا ثانوی کردار ہم بھی تھے
ہم پر وفائے عہد انالحق بھی فرق ہے
اس واسطے کہ صاحب اسرار ہم بھی تھے

.....

جو مستجاب ہو نہ سکیں بے اثر گئیں
دل ایسی بے شمار دعاؤں کی زد میں ہے

.....

عشق کی ناتمام آرزوؤں نے دل پُر درد میں کہرام بپا کر رکھا ہے۔ یہ آرزوئیں ایسے خواب ہیں، جن کی تعبیر ہنوز پردۂ مستقبل میں کہیں نیم خوابیدہ ہو گی اور ایک دن وہ روبرو ہو کر خواب کو حقیقت میں بدلنے کا مژدۂ جاں فزا سنانے پر آمدہ نظر آئے گی فی الوقت یہ تعبیر دل کے آنگن میں یادوں کو مہکتے بازار چھپانے میں ایک معمہ بن چکی ہے۔ ''خواب ریزے'' شب غم یا وعدۂ فردا کے مہتاب سے پھوٹنے والی کرنوں کی مثال ہیں جو دشتِ بے صدا میں سحر آفریں خاموشی کا وہ سراب ہیں جنھیں تا حد نظر دیکھا جا سکتا ہے۔ کرامت بخاری نے اپنی روئیداد کا اظہار ایک غزل مسلسل میں کیا جو بجائے خود ان کے خلوت کدے میں ان کی مونس وغمخوار بن گئی حالانکہ یہ روئیداد ایک بیاضِ عبرت ہے جس میں ہمارے معاشرے کے خدوخال کو لفظوں کی خوبصورت بُنت میں دیکھا جا سکتا ہے:

مرا یہ جسم و جاں ہے اور میں ہوں
کرائے کا مکاں ہے اور میں ہوں
خیالِ رفتگاں ہے اور دل ہے
غمِ آئندگاں ہے اور میں ہوں
تعاقب کر رہا ہوں پا پیادہ
غبارِ کارواں ہے اور میں ہوں
کرامت زندگانی کے سفر میں
غمِ سود و زیاں ہے اور میں ہوں

.....

کرامت بخاری روایتی غزل کہنے یا فرسودہ خیال کو عنوانِ غزل بنانے کے حق میں نہیں مگر روایت کو آگے بڑھانے اور لفظوں کو نئے معانی پہنانے میں دلچسپی رکھتے ہیں، ان کے ہاں موضوعات اور مسائل کو غزل میں اولیت دینے کا رجحان نظر آتا ہے اس کے باوصف وہ روایت کی پاسداری کا لحاظ رکھتے ہیں، لفظ برتنے کا سلیقہ اور اپنے موضوع کو غزل کی نزاکت سے ہم آہنگ کرنے کا برتاؤ جہاں موضوع کی اہمیت سے قاری کو باخبر کرنے کا وسیلہ بنتا ہے وہاں تغزل کا حسن بھی برقرار رکھنے میں سہولت فراہم کرتا ہے:

دولتِ رنجِ رائیگاں میری
پر یہ دولت بھی اب کہاں میری
کچھ تو شعر و سخن کا موسم ہے
کچھ طبیعت بھی ہے رواں میری

.....

زیست کی بیکراں مسافت بھی
چند لفظوں کی داستاں تک ہے

.....

ہمیں صحرا کی سلطانی ملی ہے
وراثت میں یہ ویرانی ملی ہے
عزاخانۂ خلوت میں کرامت
متاعِ مرثیہ خوانی ملی ہے

.....

ہر عہد میں زندگی نئی کروٹ لینے اور نئے واقعات کو جنم دینے میں نئے افراد انسانی کو متعارف کرواتی ہے، نئے چہرے، نئے خدوخال اور نئی قامتِ فکر سامنے آرہی ہے، دنیا انقلاب کی زد پر ہے، جو برا بھلا دیکھنے کو ملتا ہے اسے کرامت بخاری نے زندگی کی سب سے بڑی حقیقت خیال کیا ہے اور غزل میں عہد موجود کی نفسیات اور عالمی طبقاتی کشمکش کا المیہ دل میں کہرام بپا رکھتا ہے، ایک حساس اور جہاں دیدہ آدمی اس منظرنامے کی خموشی سے اُبھرنے والے طوفان سے باخبر ہے، کرامت بخاری کی نگاہ دوررس دیکھتی ہے کہ نئی تاریخ کے پردے میں نیا بحران جنم لے رہا ہے- وہ غزل کے اس موضوع کو اپنے مخصوص انداز اور سہل ممتنع میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ دل میں کسک سی پیدا ہوتی ہے کہ اس تبدیلی کے دونوں پہلو یعنی نفع اور نقصان سے ہمیں سابقہ پڑ رہا ہے، انداز اظہار اور نفس مضمون میں مطابقت کے ساتھ کیف و کم کی فضا پیدا کرنا کرامت بخاری کا فنی معجزہ ہے جو ان کی غزل کو معیار سے ہمکنار کرتا ہے اور قاری کی فکری بصیرت کا اعتبار بڑھاتا ہے:

نیا انسان لکھا جا رہا ہے
بصد امکان لکھا جا رہا ہے
عجب اک سانحہ ہے میرے گھر میں
مجھے مہمان لکھا جا رہا ہے
ہر اک سو چھائی جاتی ہے خموشی
کوئی طوفان لکھا جا رہا ہے
وہی جو واقف رازِ دروں ہے
اسے انجان لکھا جا رہا ہے
یہ جو کچھ ہو رہا ہے رفتہ رفتہ
وہ سب نقصان لکھا جا رہا ہے

.....

زندگی ایک ایسی کہانی ہے جس کے لیے لفظ کم پڑ جاتے ہیں، ہمارے شاعروں نے اس کہانی کو نظم کیا اور زندگی کی فضا پزیری اور اپنی نادانی کا نوحہ لکھتے ہوئے مرزا غالب

نے بھی اعتراف کیا ہے کہ پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں۔ پھر وہی زندگی ہماری ہے۔ مگر زندہ رہنے کی تمنا سے ہم نے ہاتھ نہیں اُٹھائے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ موت اک چھپتا ہوا کانٹا دل انساں میں ہے اور موت سے کسی کو مفر نہیں لیکن شاعروں نے اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے باوصف کرامت بخاری جیسے شاعر کو بھی اپنا ہمنوا بنایا البتہ انداز اظہار میں رجائیت کے سبب نئے امکانات پیدا ہوئے ہیں:

وہاں تک ہماری کہانی گئی
جہاں تک گئے زندگی کے قدم

.....

غزل میں نئی اور منفرد تراکیب سہل ممتنع میں قدرے محال ہوتی ہیں کہ دوسرے خیال کا حسن و جمال تراکیب کا طلبگار نہیں ہوتا، مگر اس کے باوجود کرامت بخاری کی غزل میں بعض انوکھی اور چونکا دینے والی تراکیب برتی گئی ہیں کہ لطف دوبالا ہو جاتا ہے، ان تراکیب میں شعوری کوشش کا عملی دخل نہیں ہوتا بلکہ یہ تراکیب خود بخود معرض وجود میں آجاتی ہیں مثلاً عالم شام جدائی، کسب کمال، واقف رازِ دروں، خوف خزاں گرفتِ چشمِ حیراں، اقلیمِ محبت، منزل پندارِ آگہی۔ دامِ تعصبات۔ فکر نارسا۔ حریمِ دل۔ مشامِ جاں۔ طالب پیکانِ نظر۔ ایسی اور بہت سی تراکیب کرامت بخاری کی غزل میں تلاش کی جاسکتی ہیں، دراصل حسنِ تراکیب ذہن رسا اور تصورِ سخن ور کی جمالیات کا مظہر ہوتا ہے۔ تغزل میں ترسیلِ مفہوم کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن الفاظ کا چناؤ اور برتاؤ کسی فنکار کا معنوی انداز نظر کہلاتا ہے اور کرامت بخاری کی مشقِ سخن کا حاصل یہی ہے کہ وہ غزل کو مطلع سے مقطع تک ہر شعر کی چھان پھٹک کے حوالے سے ریاضتِ فن پر انحصار کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے ہاں کلاسیکی رنگ و آہنگ میں ایک طرف سادگی اور پرکاری نے روایت کی اہمیت کو اُجاگر وہاں بدلتے رجحانِ شعری اور جدید غزل کے لہجے کو اپنا کر شعر کی آبرو بڑھانے کا اہتمام کیا ہے:

ہاتھ میں کاسہ رہ جاتا ہے
خواب ذرا سا رہ جاتا ہے
بربادی کے بعد کرامت
ایک دلاسہ رہ جاتا ہے

.....

ڈھونڈ کر لایا ہوں اک موسم نیا
میں نیا ہوں اور میرا غم نیا
ڈھونڈنا ہو گا کرامت آپ کو
زخمِ دل کے واسطے مرہم نیا

.....

زمیں پر آسماں رکھا ہوا ہے
مجھے بھی درمیاں رکھا ہوا ہے

کرامت یہ کرامت ہے غزل کی
مجھے اس نے جواں رکھا ہوا ہے

.....

غزل میں صنائع بدائع لفظی و معنوی روایت کا درخشندہ باب ہے مگر کثرت استعمال اور کسی صنعت کا اہتمام تصنع یا غزل میں آورد کا پیش خیمہ ہوتا ہے جسے خوبی کم اور خرابی خیال کیا جاتا ہے۔ کرامت بخاری کے ہاں فطری انداز میں چند صنعتیں برتی گئیں خصوصاً صنعتِ تضاد سے غزل کو نوازا گیا ہے:

جسے مجھ پر عیاں ہونا تھا لازم
وہی مجھ سے نہاں رکھا ہوا ہے

.....

جو مُردہ باد ہونا چاہیے تھا
وہ زندہ باد ہوتا جا رہا ہے

.....

اپنی انا کا قیدی ہے
کہنے کو آزاد ہے وہ

.....

بات ملنے کی بار بار کرو
میں خزاں ہوں مجھے بہار کرو

.....

نئے قصے پرانے تذکرے ہیں
نئی وجہوں پہ ماضی کا اثر ہے

.....

کرامت بخاری نے غزل کو ذریعۂ اظہار بنا کر اپنے طرزِ احساس اور حیات آفریں نقطۂ نظر کے علاوہ محبت کی ہمہ گیریت سے قارئینِ شعر و ادب کو حصارِ آگہی میں لینے کو سہیل کی ہے۔ ان کی زندگی میں جتنے نشیب و فراز آئے انھیں غزل کی زبان میں کمالِ لطافت سے صورت اظہار دی ہے، وہی اول و آخر غزل جیسی صنفِ سخن سے گہرا شغف رکھتے ہیں اور اپنے قاری کو ہمنوا بنانے میں کامیاب و کامران ہیں۔ ان کے شعر کا اثر تیر بن کر دل میں ترازو ہو جاتا ہے۔ خواب ریز سے تعبیرِ غزل کی صورت ادبی دنیا میں نئے امکانات کا مژدہ جاں فزا ہے جسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا:

غم ہوں گے ہر آن زیادہ
اس کا ہے امکان زیادہ
صبح ہوئی تو سوچ رہا ہوں
شمع جلی یا جان زیادہ

.....

خواب کو سچ میں ڈھالنے کی لگن
آج پہلے سے کچھ زیادہ ہے
تنگ دل آ بسے ہیں گلیوں میں
ورنہ یہ شہر تو کشادہ ہے
یہ جو وعدہ ہے پھر نیا اس کا
پہلے وعدوں کا ہی اعادہ ہے
کیوں نہ ہو میر سے مجھے نسبت
وہ بھی میرا ہی خانوادہ رہے

☆☆☆☆☆

میں اجنبی سہی!۔۔۔سیّد آلِ احمد

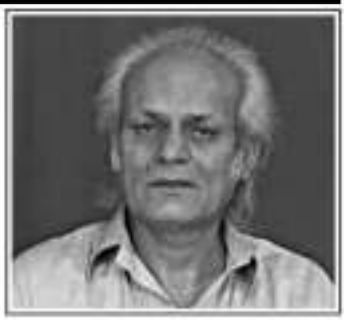

ہم اہلِ دل سے ترکِ مراسم کا دکھ نہ پوچھ
شاخِ شجر سے ٹوٹ کے پتا گرے تو دیکھ

.....

12 ستمبر 1940 کی صبح کا ذکر ہے۔ ویسے تو گرمیوں کی رُت تھی لیکن اہلِ یورپ دوسری عالمی جنگ کے شدید موسم سے دوچار تھے۔ جنگل کے کنارے گرتیسہ رنگ پتوں کی بارش کا نظارہ کرتے ہوئے، کاغذ تیار کرنے والے کارخانے کے مشینی شور میں لپٹی آبادی کو پیچھے بلکہ بہت نیچے چھوڑتے ہوئے وہ چار نوعمر دوست فرانس کے چھوٹے سے جنوب مغربی قصبے مونتی نیک میں اونگھتے اپنے گھروں سے کچھ دور واقع پہاڑی 'لاسکو' کی سیر کو نکلے ہوئے تھے۔ ان کے راستے میں دوسرے درختوں کے ساتھ دیوقامت سرو وصنوبر بھی پراسرار سایوں کی طرح سرسرا رہے تھے۔ ڈرتے ڈرتے ہی سہی مگر انہیں اس جنگل سے گزرنا تو تھا:

جنگل سے گزرنا پڑتا ہے
ہر سائے سے ڈرنا پڑتا ہے

'تاریخ وثقافت کی وادیوں میں کہیں دکھ اور کہیں دوا کی علامت سرو وصنوبر بھی کیا سایہ رکھتے ہیں؟ ایران میں چار ہزار برس سے حالتِ جذب میں کھڑا 'سروِ ابرکوہ' لہلہاتا ہوا کیسا لگتا ہوگا؟' ترکی کی ابدی آرام گاہوں میں جابہ جا ایستادہ 'سرو مزار' اور 'سرو سیاہ' میں کیا فرق ہوتا ہے؟'' کوئی سوچنے لگا۔ اور یک دم قدیم رومن شاعر اووڈ کی منظوم داستان سے پھوٹتی نوعمر سائپریسس کی درد بھری سسکیاں اشکوں میں ڈھلتی محسوس ہونے لگیں۔ فردوسی کے 'شاہ نامہ' میں بسی سرو صنوبر کی مہک ڈی ایچ لارنس کی نظم 'سائپرس' میں انسانی دکھ کی تاریخ رقم کرتی ہوئی، محمود درویش کی 'ایک صنوبر ٹوٹ گیا' میں سوچ کے رنگ بھرنے لگی اور لبنانی شاعر بسام حجار کے احساس کو بسدا بہار اظہار عطا کرنے لگی جو کہتا ہے:

حامد یزدانی

صنوبر کسی پیڑ کا نام نہیں
وہ تو پیڑ کے دکھ کا نام ہے
صنوبر کا سایہ نہیں ہوتا کہ وہ تو خود سایہ ہے
--- پیڑ کا

.....

تہذیب کے سینے پر صنوبر کے دکھ کے سائے
کیا شاعر کے بطن میں موج زن ابدی رنج
سے زیادہ قدیم ہیں؟ کیا وہ بھی سدا بہار
ہیں؟ سوال کی خاموش اور شفاف دیوار پر
سیّد آل احمد کا یہ شعر لہرانے لگا:
اب کتنا نچوڑے گی لہو ساعتِ شفاف
تہذیب کے سینے پہ صنوبر کی طرح ہوں

.....

''دیکھو، ذرا آہستہ چلو، دھیان سے، اریذرا
بچ کر--- سرو صنوبر میں کانٹے بھی ہوتے
ہیں۔'' مارسل رویدا کے ایک دوست نے
اسے خبردار کیا تھا کیونکہ مارسل ان
تینوں سے کچھ زیادہ ہی تیز چل رہا تھا تا کہ
وہ آگے آگے چلتے اپنے پالتو کتے 'روبوٹ'
پر نظر رکھ سکے۔ موسمِ گرما خزاں کے استقبال
کو سرخ، نارنجی، سبز اور پیلے پتوں کی
جھنڈیاں لہراتا ان سے پہلے ہی پہاڑی پر
جھوم رہا تھا۔ اب کسی بھی دن خزاں کو آ کر
بہار کا حال دریافت کرنا تھا:
پوچھتی تھی خزاں بہار کا حال
شاخ سے ٹوٹ کر گرا پتا

.....

اور پھر کئی پتے گرے اور گرتے چلے
گئے۔ خطے میں نازی جرمن فوجیوں کی پیش
رفت سے بظاہر لاتعلق گرما کے الوداعی موڑ
پر کھڑے بے ترتیب درخت اور خود رو
جھاڑیاں لگ بھگ سارے ہی بنیادی اور
ثانوی رنگوں کی آمیزش سے یورپ کے
زمینی کینوس پر فطرت کا ایک وسیع فن پارہ
تخلیق کرنے میں مصروف تھیں۔
''روبو --- روبو --- کہاں ہو تم؟ --- اوہ
خدایا! کہاں غائب ہو گیا یہ روبو کا بچہ!''
روبوٹ کے یوں اچانک نظروں سے
اوجھل ہو جانے سے مارسل گھبرا سا گیا
تھا۔ باقی تین ساتھیوں کی پرواہ کیے بغیر وہ
اپنے ننھے دوست کا نام پکارتے ہوئے
اِدھر اُدھر بھاگ رہا تھا۔ پھر اچانک وہ کہیں
دُور سے آتی روبوٹ کی آواز سُن کر ٹھٹک گیا
تھا۔ 'کہاں سے آ رہی ہے یہ آواز؟' یہ
سوچتے ہوئے مارسل زمین پر جُھک
گیا۔ آواز اُس چھوٹے سے گڑھے میں
سے آ رہی تھی جو عموماً لومڑیاں اپنے چھپنے کو
بنایا کرتی ہیں۔ مارسل نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور
اپنے ہاتھوں سے جلدی جلدی مٹی کو ہٹا
کر گڑھے کے دہانے کو کشادہ کرنے میں
جُت گیا۔ روبوٹ کی آواز بتدریج واضح ہوتی
جا رہی تھی۔ اتنے میں مارسل کے دوست بھی
اس کے قریب آ کھڑے ہوئے تھے۔ دہانا
چوڑا کرتے ہی مارسل اپنے دوست کو
بچانے کے لیے گڑھے کے اندر داخل ہو گیا
اور از خود نیچے کی طرف سرکتا چلا گیا:
'نیچے تو اترنا پڑتا ہے'

.....

تہہ میں فرش پر پاؤں ٹکتے ہی اس کی خوشی اور حیرت کی انتہا نہ رہی۔ خوشی روبوٹ کو پانے کی اور حیرت اس انکشاف پر کہ وہ گڑھا دراصل ایک غار تھا۔ ایک قدیم اور حیرت انگیز غار۔ تب اسے ذرا بھر اندازہ نہ تھا کہ روبوٹ کے کھو جانے کے حادثہ میں اس نے درحقیقت ایک عظیم تاریخی اور فنی ورثہ ڈھونڈ نکالا ہے۔

''کیا روبوٹ مل گیام مارسل؟ کیا تم ٹھیک ہو؟ کہاں ہو تم؟ ہم آرہے ہیں تمہارے پیچھے''۔ غار کے دہانے سے اس کے دوست چلا رہے تھے۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ تینوں بھی غار میں اُتر آئے۔ دہانے سے آتی روشنی انسانی آنکھ سے دیکھنے کو کافی نہ تھی۔ مستعد نوجوانوں نے فوری ایک عارضی لیمپ کا بندوبست کیا اور غار کا جائزہ لینے لگے۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے گئے اردگرد ایستادہ دیواروں پر پتھر کے قدیم دور میں بنائے گئے کندہ کاری کے لازوال نمونے اور رنگین تصاویر اور خاکے ان کے سامنے روشن ہوتے چلے گئے۔ سب شبیہات پتھروں پر ابھاری گئی تھیں۔ ریت کے بت انہوں نے نہیں بنائے تھے۔ احمد ندیم قاسمی کی شعری نصیحت کی گونج جانے ان اچھے فن کاروں نے بیس ہزار برس پہلے کیسے سُن لی تھی کہ 'ریت کے بُت نہ بنا اے میرے اچھے فنکار--!' شبیہات کے ساتھ ساتھ ازمنہ قدیم کے عجیب وغریب جانور، بیل، گھوڑے، پرندے اور انسان بھی پینٹنگز کے رُوپ میں ماضی کے ہنر ور فن کاروں کے کمال کی داد دے رہے تھے۔ ماضی میں قریب کا نہیں بیس ہزار برس پرانا ماضی--- وہ چاروں روبوٹ کو سنبھالے ایک دوسرے پر نگاہ حیرت ڈالتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور قدم قدم پر حیرت سے ٹکرا رہے تھے--- زندگی تہہ در تہہ کہانی کی طرح ان پر آشکار ہو رہی تھی---!

لیکن سچی بات یہ ہے کہ اِس وقت میرے سامنے جو کہانی دریافت کے کوہپر چمک رہی ہے اس کا مارسل میں ہرگز نہیں۔ میں تو شاید اس کے دوستوں میں سے ایک ہوں۔ اس کہانی کا مارسل، میرے نزدیک، بھائی نوید صادق ہیں جنہوں نے سیّد آل احمد کے فن کارانہ شعری خزانہ سے مجھے متعارف کروایا۔ 'لیکن آل احمد تو شاعر ہیں، غزل نظم کے بجائے کہانی کی بات کیوں؟' آپ پوچھ سکتے ہیں۔

'شاعری بھی تو کہانی ہی ہوتی ہے۔' میں کہوں گا۔

'لیکن امریکا میں عصرِ حاضر کے نمائندہ شاعر اور سابق ملک الشعرا یلی کولنز یہ بات نہیں مانیں گے کیونکہ اُن کے نزدیک 'نظم کہانی نہیں ہوتی'۔ آپ وضاحت کریں گے۔ اس پر میں کہوں گا:

'یلی کولنز کے پیش رو اور ہم وطن عہد ساز شاعر رابرٹ فراسٹ کی نظمیں جو بیانیہ حُسن کی شان کے شاہ کار کے طور پر آج بھی ادب کے ہنر کدے کی دیواروں کی زینت ہیں اُن کا کیا کیا جائے! اس کی نظمیں تو کہانی کے طور پر ہی

لطف دیتی ہیں۔ نہیں کیا؟--- ناآشنا مناظر اور اجنبی موسموں کی کہانیاں--- کہانیاں جو امریکا کے نیو انگلینڈ میں قلم بند ہوئیں، کہانیاں جو چولستان کے تھل میں سرسراتی رہیں اور کہانیاں جو کوئی بیس ہزار برس پہلے فرانس میں 'لاسکو' کے غار میں اُس زمانے کے فن کاروں نے نقش کی تھیں۔ نقش کیا تھے گویا نیم روشن پتھریلی دیواروں پر واہمے متشکل کر دیے تھے:

واہمے نت نئی اشکال بنا لیتے ہیں
ورقِ دل کو بھی سادہ نہیں رہنے دیتے

....

پھر یوں ہوا کہ دستِ قدرت نے ان شاہکاروں کو ان مول خزانے کی طرح وقت کی نگاہ سے اوجھل یا یوں کہیے کہ محفوظ کر دیا تھا۔ ہزاروں سال بعد کھلنے والی متجسس نگاہوں اور ذہنوں کے لیے۔

اب آپ سوچیں گے--- اچھا آپ سوچیے اور ضرور سوچیے--- میں تو چلا نوید بھائی کے ساتھ کہ جن کی ہم راہی میں مجھے سیّد آلِ احمد کی فکری اور شعری گیلری کی سیر کرنا ہے۔ عہد در عہد گونجتی انسانی احساسات اور مسائل کی کہانی کے کچھ فاصلے طے کرنا ہیں اور ورق ورق منقش فنی ارتقا کی تاریخ کو اظہار کے رنگوں سے جھلکتے دیکھنا ہے--- سیّد صاحب کے اس تخلیقی لاسکو میں ابھی 'میں اجنبی سہی مگر دل کو یقین سا ہے کہ اس کثیر الجہت حیرت کدہ سے باہر آتے ہوئے احساسِ شناسائی اور جان پہچان کی کچھ نہ کچھ دولت میں بھی ضرور کما لاؤں گا--- اب سوال بس اتنا سا رہ جاتا ہے کہ کیا میں کبھی باہر آ پاؤں گا؟

میں متجسس بھی ہوں اور متفکر بھی۔

'میں جب سکوتِ شہر کا در کھولنے لگا' تو ایک سوچ، ایک جھجک آڑے آنے لگتی ہے--- اور ایسے میں سیّد آلِ احمد کی زندگی پرور آواز سنائی دیتی ہے:

'سوچتا کیا ہے، درِ قصرِ غزل کھول کے دیکھ'

....

اور پھر خاموشی اور تاریکی--- آگے کیسے بڑھیں!؟ - - - اسی لمحے فضائے دروں میں جانے کس سمت سے جدید امریکی مفکر و ادیب جارج سانٹنر کی سرگوشی در آتی ہے:

'جہاں شاعر کا لفظ انجام پاتا ہے وہاں سے ایک عظیم روشنی آغاز ہوتی ہے'--- سو، اب ہم اسی روشنی کی مدد سے آگے بڑھتے ہیں۔

جی چاہے تو آپ بھی چلیے ہمارے ساتھ--- مل کر لطف لیتے ہیں اس تخلیقی لاسکو کا جس کی غیر مرئی دیواروں پر سیّد صاحب نے اپنا دل کندہ کر رکھا ہے، کہیں 'احساس کی چھینی' سے وقت کے پتھروں پر اس کا نقش ابھارا ہے

'ایک تیشہ ہے کہ بس کاٹ رہا ہے مجھ کو'

....

اور ایسی خود تراشی کے دل سوز عمل سے بھی انہیں تکمیلِ درد یا کمالِ ہنر کی سی تسکین حاصل ہوتی ہے کہ:

'ہنرِ تیشہ زنی آ تو گیا ہے مجھ کو'

اور کہیں جذبات کے رنگوں سے اس کی

تصویر کشی کی ہے--- ایک قصرِ غزل استوار کیا ہے۔ صناعی و ہنرمندی کا نمونہ وہ بے مثل قصرِ غزل ---

'جس کی تعمیر میں زخموں سے سجایا ہے بدن'

.....

جانے کتنی جہتیں ہیں اس غار کی، اس گہری نمائش گاہ کی!--- اور ہر جہت میں کیا کیا رنگ بکھرے ہیں، کیا کیا منظر جھلک رہے ہیں ---! --- یہاں وہاں، اِدھر اُدھر --- ایک جہاں، ایک عالم ثبت ہے ہر سُو --- ایک مرقع، میر کے الفاظ میں:

عالم بیتِ مجموعی سے ایک عجیب مرقع ہے
ہر صفحے میں، ورق میں اس کے دیکھے تو عالم دیکھے

.....

مگر یہ حیرت کدہ فرانس کے کسی قصبہ میں تو ہو نہیں سکتا یہ تو کسی آنکھ ہی میں روشن ہو سکتا ہے، اسی میں سما سکتا ہے اور بکھر بکھر کر زبانِ حال سے کہہ سکتا ہے:

مجھے بھی دے گا کوئی شہر میں کبھی ترتیب
ہے کوئی آنکھ؟ کہ بکھرا ہوا ہے شیرازہ

.....

یہ مرتب بکھراؤ دیکھ کر آنکھیں استعجاب نہ جھپکیں تو اور کیا کریں:

'تار الگ یہ کس نے کیا شیرازے سے؟'

.....

اِدھر مغربی مرغزاروں میں سرگرداں اہلِ دانش حیراں ہیں کہ بیس ہزار سال پہلے لاسکو کے یہ فن کار دلدل کے کنارے کنارے کس طرح ساڑھے تین سو کلومیٹر کا سفر کیا کرتے تھے محض پہاڑوں سے وہ دھات لانے کو جسے جلا کر وہ اپنے فن پاروں کے لیے سیاہ رنگ بنایا کرتے تھے مگر اُدھر مشرقی ریگ زار کے پاس 'شہر میں دشت کی طرح رہنا' گنگناتا ہوا ہمارا ایک سچا فن کار بس ایک آنسو کے طویل سفر کی داستان رقم کرنے میں مشغول ہے کہ احساس اور کرب کی کس گہری اندرونی مسافت کے بعد وہ ایک کیدل سے دوسرے کے رخسار تک پہنچتا ہے۔ راہ میں ترغیبات کے کیا کیا دلدل نہیں پڑتے، جبر کی کیا کیا کھائیاں نہیں آتیں مگر ضبط ست نمائی پر مامور رہتا ہے:

کس مسافت کے بعد پہنچا ہے
تیرے رخسار پہ مرا آنسو

.....

اس مسافت کی داد کون زبان دیگی!؟ اس حوصلہ کی تحسین کون سخن کریگا!؟ آنسو کی مسافت رُخسار تک تو بیان بھی پا گئی مگر کسی کی آنکھوں میں اپنے خوابوں کو رونے کی اجازت دینے کا روادار وہ اب بھی نہیں کہ یہ خلافِ شانِ ضبط ہوگا:

'میری آنکھوں میں مرا خواب نہ رونے آئے'

.....

رونے سے اظہار بھی ہو جاتا ہے اور دکھ کم بھی ہو جاتا ہے جو شاعر کو منظور نہیں۔ وہ تو اپنی چشمِ کم ہنر کو کمال آشنا دیکھتا ہے۔

وہ سنگِ زرد کو چاہے تو سُرخ رُو کر دے
یہ ایک خوبی بھی اب چشمِ کم ہنر میں ہے

اس ادراک کے باوصف کہ 'کوئی بھی رنگ

قوسِ نظر دائمی نہیں، سچا فن کار تخلیقی خاکوں میں ابدگیر رنگ بھرنے میں کوشاں رہتا ہے۔ اس کا سفر بظاہر لاحاصلی اور رائگانی کا سفر ہی کیوں نہ ہو، وہ اسے سانس کے آخری کنارے تک جاری رکھتا ہے کیونکہ اس کے اندر 'اک رنج رائگاں کی طلب بے شمار ہے'۔ شاید اس کا یقین اس احساس پر استوار ہوتا ہے کہ

'اُس کی خواہش ہے کہ میں اپنا سفر جاری رکھوں'

.....

صدائے قدرت پر لبیک کہتے ہوئے وہ پتھروں سے صورتیں، سوچ سے رنگ اور خیال سے حرف تراشتا چلا جاتا ہے اور اس پُر لطف تخلیقی اذیت کی رہگزر پر یہ گنگناتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے:

'بہت خوش ہوں میں فن کی سرزمیں پر'

.....

ماضی میں سنگِ زرد کو سُرخرو کرنے والے لاسکو کے فن کاروں نے جس طرح اپنے فن کو وقت کی دست برد سے محفوظ کرنے کے لیے غاروں میں چھپا دیا تھا۔ ہمارا فن کار بھی قدرتی طور پر اپنے شہ پاروں کو دنیاداری اور غرض کی دھوپ سے بچانے کا خواہاں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ:

'دھوپ میں بھی رنگ اُڑ جاتا ہے ہر تصویر کا'

اس کی فکر مندی بجا ہے کیونکہ اس کی چشمِ تصور میں حد سے زیادہ روشنی میں جلتا یہ بے سایہ منظر گھوم رہا ہے:

اتنے سورج نکل آئے ہیں افق پر احمدؔ
زیرِ دیوار بھی سایہ نہیں رہنے دیتے

.....

اور ہنر کی یہ دیواریں بھی کیسی عجیب ہیں! یہ اینٹ، پتھر اور گارے سے بنی ہوئی نہیں ہیں۔ ان کی تعمیر میں کچھ اور ہی صرف ہوا ہے۔ دیکھنے کو تو چشمِ زمانہ نے دیوارِ گریہ سے لے کر دیوارِ چین تک بلکہ دیوارِ برلن تک کون کون سی دیواریں نہیں دیکھ رکھیں مگر ایسی دیوار نہ دیکھی ہو گی جو آواز سے تعمیر ہوئی ہو۔ ہمارا فن کار ایسی انوکھی دیوار کی طرف اشارہ کرتا ہیاور بہت انوکھے ڈھنگ میں کرتا ہے:

میری آواز کہاں تک تری دیوار بنے
شدتِ کرب سے تو بھی تو کبھی بول کے دیکھ

.....

فن اور فن کار کی دنیا بھی عجب ہوتی ہے کہیں آواز دیوار میں ڈھلتی دکھائی دیتی ہے اور کہیں دادِ سخن دیتی سنائی دیتی ہے:

احمد قحطِ سماعت سے دیواروں کو
تازہ غزل کے شعر سناتے پھرتے ہیں

.....

دل چسپ حقیقت اس وقت آشکار ہوتی ہے جب معلوم ہوتا ہے کہ جس پر ہمارے شاعر کو دیوار کا گماں گزرا تھا وہ دراصل اندھیرے میں کھڑا کوئی منتظر دل جلا تھا۔ اسی کو مخاطب کرتے ہوئے وہ کہتا ہے:

گزرے ہوئے لمحے کبھی واپس نہیں آتے
کیوں صورتِ دیوار اندھیرے میں کھڑا ہے

.....

کون جانے کہ یہ اندھیرے میں صورتِ دیوار کھڑا شخص شاید وہی ہو جو کبھی جگنوؤں کی روشنی میں اُجلی اور سچی باتیں رقم کیا کرتا

تھا مگر ورق پر نہیں---:
زخم زخم گنتا تھا روشنی میں جگنو کی
حرف حرف پلکوں پر سچی بات لکھتا تھا
زخم زخم گنتا تھا روشنی میں جگنو کی
حرف حرف پلکوں پر سچی بات لکھتا تھا

.....

اب تو ہر سو تاریکی کا ڈیرہ ہے۔ اندھیرے کا راج ہے۔ اور ہم؟ --- 'ہم ذات کے اوراق پہ بکھری ہوئی شب ہیں'۔ اب شب کے اسی اندھیرے میں چمکتی ہیں سرگوشیاں اور 'اب اندھیرے میں مہکتا ہے گلاب'۔ اندھیرے سے جُڑے مسائل میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں دوسرے کے کیا اپنے خال و خد پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے:
تو میرے خال و خد بھی پہچان کے تو دیکھ
آئینہ ساز! میں بھی ترے آئنے میں ہوں

.....

یہ بھلا کیسا آئنہ ساز ہے جو خود آئنے میں جھانکنے کی ہمت نہیں کرتا کہ دیکھ سکے کون اس میں چھپ کر بیٹھا ہے!
جمال احسانی ایک بار کہہ رہے تھے کہ غزل دکھانے سے زیادہ چھپانے کا نام ہے۔ بات کو تحفہ کی طرح حرف و معانی کے اندر تہہ در تہہ چھپا تجانے کا عمل۔ اس کی پرتیں کھولنے کا کام دوسروں کا ہے۔ ہر قاری بحدِ فہم و بصیرت اس سے استفادہ کرتا ہے۔ شعر بھی تو خزانے ہی کی طرح ہوتا ہے دیگر تمام فنون اور فن پاروں کی صورت۔ دکھ دینے والا، مسرت اور تسکین بخشنے والا اور حیرت سے آشنا کرنے والا خزانہ--- جیسے لاسکو کے غاروں میں مارسل اور اس کے تین نوعمر دوستوں کو ملا تھا اور وہ نیم روشن دیواروں اور چھتوں سے جھانکتے ہنر کے دلآویز نمونوں کو دیکھ دیکھ کر حیرت زدہ تھے اور سوچ رہے تھے کہ اس خزانے کا کرنا کیا چاہیے؟ اس کا علم اپنے تک ہی رکھیں یا باہر جا کر دوسروں کو اس سے آگاہ کریں؟ میں سوچتا ہوں ہزاروں سال پہلے کی پتھر پر کندہ تصاویر اور رنگوں سے بنی پینٹنگز یقیناً قیمتی اور منفرد دولت ہیں لیکن درد کے ازلی خزانے کے مقابل اس کی اہمیت کیا ہوگی! درد کا خزانہ--- درد کا اتنا بڑا خزانہ ہر کسی کو نصیب نہیں۔ یہ خزانہ مالک ایسے سوچنے اور محسوس کرنیوالے ہی کو عطا کرتا ہے جو اس سے امید رکھتا ہے کہ وہ 'مجھے سلیقۂ تزئینِ ذات دے دے گا'۔ ایسے فن کار کے سامنے یہ سوچ ہمہ وقت سوال بن کر ابھرتی رہتی ہے:
چھپاؤں کیسے، کروں کس طرح اِسے تقسیم
دیا ہے درد کا اتنا بڑا خزانہ کیوں

.....

میرا خیال ہے سیّد آلِ احمد کے اس ان مول اور اجنبی خزانے کو پوری طرح کھوجنے میں مجھے ابھی بہت وقت لگ جائے گا۔ میں تو ابھی نوید صادق کے ساتھ کچھ اور آگے جاؤں گا--- کچھ اور بھٹکوں گا ان تخلیقی راہداریوں میں--- آپ چاہیں تو یہاں سے لوٹ سکتے ہیں--- یہیں کہیں ہے بیرونی دروازہ۔ فکر مت کیجیے 'راستہ ڈھونڈنے میں سیّد صاحب کی 'برق تبسمات' آپ کی مدد کرے گی--- خدا حافظ

☆☆☆☆☆

''فسانۂ کون ومکاں'' واقعی ''فسانۂ کون ومکاں'' ہے

غالب فہمی کے دعویدار تو ہم کبھی نہ تھے، البتہ غالب سے محبت وعقیدت کے پیشِ نظر چشمِ تصور سے کئی بار دیکھنے کی کوشش کی کہ غالب اگر عہدِ موجود میں ہوتے تو کیسا دِکھتے، کیسا لکھتے؟ ---- لیکن ہر بار کوئی بھی مفروضہ قائم کرنے سے قاصر ہی رہے۔

پچھلے دِنوں ایک شعری مجموعہ ہاتھ لگا تو ہم چونک گئے، اوّل تو اِس مجموعہ کے عنوان ہی نے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

''فسانۂ کون ومکاں'' ---- اُستاد غالب کی طرح زمینی دُکھ جھیلنے والے آفاقی دُکھوں کو بھی محسوس کرتے ہیں تو ہم جیسے طالبِ علم متحیر ہی ہو سکتے ہیں۔

جناب شارق جمال خان سے چند شعری نشستوں میں کچھ غزلیں سننے کا اتفاق ہوا جن سے ان کی ادبی شخصیت کا بھرپور تاثر قائم ہوا۔ اور ہم بھی اُن کے بہت سے دیگر چاہنے والوں کی طرح ان کی فکری بلندی کے معترف ہوئے مگر ''فسانۂ کون ومکاں'' کے سفر پر نکلے تو اندازہ ہوا کہ یہ جو ایک بلند سرکاری منصب پر بیٹھا ہوا شخص ہے اندر سے کیسا درویش ہے۔

ہم نے انہیں ان کی نشستِ خاص پر رونق افروز بھی متعدد بار دیکھا - جہاں ظاہری حیثیت والے آئیں تو انہیں وہ اپنے منصبی رکھ رکھاؤ کے ساتھ ہی ملتے نظر آتے ہیں جبکہ جونہی کوئی شاعر یا شعر سے تعلق رکھنے والا اُن کے بڑے سے دفتر میں داخل ہوا تو اُس کا کھڑے ہو کر استقبال کرتے انہی کو دیکھا کہ وہ جانتے ہیں کہ مغلوں کے جدِّ امجد ظہیرالدین بابر اپنی فتوحات سے زیادہ اپنے لازوال شعر کے سبب ہمارے حافظے میں ہیں:

نَو روز وَ نَو بہار و مے و دلبرے خوش اَست
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست
ظہیرالدین بابر

اعجاز ثاقب

آج جواں بخت جہاندار اپنے ولیٔ عہد ہونے کے سبب اہم نہیں بلکہ اپنے شعر کے باعث زندہ ہیں:

آخر گِل اپنی صَرفِ درِ میکدہ ہوئی
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

جواں بخت جہاندار

سو "فسانۂ کون ومکاں" کا خالق اعتراف کرتا ہے:

کہاں کے منصب وجاہ و حشم کہ منکر ہوں
مَیں کب سے تکیہ و اورنگ و تخت و مسند کا

....

"فسانۂ کون ومکاں" جا بجا فلسفیانہ موضوعات سے مزین ہے

مجھے فسانۂ کون و مکاں جو اَزبر تھا
زمیں کے ساتھ ہی حاصل کیا زماں مَیں نے

جہانِ نو کوئی ابھرا مرے تخیل میں
جو کی تلافیٔ آشوبِ دو جہاں مَیں نے

....

شاعر وجدانی سطح پر اتنا بیدار ہے کہ اُسے ماقبل اَز جہان کی ساری داستانیں یاد ہیں اور وہ ان سے جہانِ نَو کی تعمیر کیلئے کوشاں نظر آتا ہے، وہ اپنے سیارہ کے علاوہ بھی زندگی کو کھوجتا نظر آتا ہے۔

"فسانۂ کون ومکاں" پڑھ کر متعدد بار یہ احساس ہوا کہ غالب اگر عہدِ موجود میں ہوتے تو دِکھتے تو خدا معلوم کیسے مگر لکھتے کچھ ایسا ہی، وہی کرافٹ کا حُسن وہی موضوعات کی گہرائی کہ شاعر حُسن کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی سطح پر نہیں آتا۔

ہے ترا حُسن مرے قفلِ حقیقت کی کلید
رازِ سربستہ ہوں بس تجھ سے کھُلا کرتا ہوں

....

ہر ایک نقش ہو جس کا طلسمِ ہوش رُبا
اب اِس طرح کی یہاں خال خال صورت ہے

....

خوشبو نے اُس کی لالہ و گُل سے کیا کلام
پھر اہتمامِ آمدِ موجِ صبا کیا

....

مجھے آگاہیٔ حُسنِ ازل پہلے کہاں تھی
جمالِ دو جہاں کی بات تیرے بعد کی ہے

....

"فسانۂ کون ومکاں" کا خالق ایسی بیدار روح ہے جسے معلوم ہے لا فنا انسان کا ابدی مسئلہ ہے سو وہ پکار اُٹھتا ہے:

نہیں قبول یہ دُنیائے بے بقا تو لو
کوئی نمونۂ ہستی نیا بناتے ہیں

....

اور دعوتِ بقا وہی دے سکتا ہے جس پاس ہُنر کا اسمِ اعظم ہو جو جانتا ہو کہ:

کیسی عجیب فطرتِ تخلیق ہے کہ یاں
آوازِ کُن ابھر کے صدائے قضا ہوئی

....

"فسانۂ کون ومکاں" کے خالق کو اپنے گماں کا ایسا یقین ہے کہ وہ وثوق سے کہہ سکتا ہے:

مکاں تو ہے ہی نہیں، لامکاں تو ہے ہی نہیں
مرے گمان سے ہٹ کر جہاں تو ہے ہی نہیں

بس اِک یقیں کا تماشہ ہے یاں چہار طرف
بس اِک فریبِ جہاں ہے جہاں تو ہے ہی نہیں

یہ فنکار کائنات کے حُسن کو دیکھتا ہے تو اپنے قارئین پر وہ اَسرار نہ صرف وا کرتا ہے بلکہ متشکل بھی کر دیتا ہے:

العاتق الثریا و القوس و الازار
شب کو کمالِ حُسن ، سماوات ہو گیا

فلسفیانہ موضوعات عجب سہولت سے شعری شکل اختیار کرتے نظر آتے ہیں:

شکستہ پا ہیں کوئی آسرا بناتے ہیں
مٹا کے خود کو جو ہم اِک خدا بناتے ہیں

سمجھ چکے ہیں یہ واماندگانِ شوق کہ یاں
ہر اِک نشاط کی گویا ملال صورت ہے

یہ کائنات عظیم و کبیر نام آور
ہے اِک گماں تو اسے پائمال کیوں نہ کروں

میرے پیمانے جدا ہیں میری دُنیا اور ہے
مسترد یہ کائنات بے بصر کرتا ہوں مَیں

عشق میرا بھی جنوں خیز ہے بے حد لیکن
سب خبر مجھ کو دمِ بے خبری ہوتی ہے

اِک نئی حیرت کہیں سے مِل گئی
گرچہ تھا اِک عمر سے حیران مَیں

عدم وجود سے جب آشنا ہوا ہو گا
اُس ایک لمحۂ حیرت میں کیا ہُوا ہو گا

مسئلہ ہست و بود کا ہوں مَیں
جانے ہوں بھی کہ واہمہ ہوں مَیں

مجھ میں پروان چڑھ رہی ہے خرد
اِک نئے کل کا ولولہ ہوں مَیں

واں حقیقت ہی کوئی اور نظر آتی ہے
چاک جب پیرہنِ دیر و حرم ہوتا ہے

اشعار کا انتخاب کرنے بیٹھیں تو شاید پوری کتاب نقل کرنی پڑے کہ شاعر نے بیشک طویل غزلیں بھی کہیں لیکن آپ کو پھر بھی انتخاب کا گمان ہو گا سو اختصار سے کام لیتے ہوئے کچھ اشعار ہی نقل کیے ہیں۔

شارق جمال خان کی نظم بھی نظمیہ بلندی پر فائز نظر آتی ہے

"فردوس"، "باڑن کی تمنائے اسفل کا غیر فلسفیانہ جائزہ"، "اراٹو"، "میری ذات کا کوہِ ندا"، "پرولو"، "کوہِ اولمپس پر رونما ہونے والا ایک فرضی واقعہ"، "یکتا"، "فریم آف ریفرنس"،

اور دیگر بہت سی نظمیں ایک بلند پایہ فلسفی شاعر کی نظم ہونے کا اعلان تو کرتی ہیں لیکن ساتھ ساتھ فنی عجز و انکساری بھی نظر آتی ہے کہ علم فنکار کے فن کا درونی جزو لگتا ہے، اعلانِ علم کا ذریعہ ہرگز معلوم نہیں ہوتا۔

وہ اپنی شعری لغت ترتیب دیتے نظر آتے ہیں:

وہ سیہ فام و بلا نوش آنکھیں
وہ عجب ریشمی شب پوش آنکھیں
وہ تری بولتی خاموش آنکھیں

جسم انساں کی برہنہ دانش
حکمتِ ذہنِ گنہگار نئی

اس تخلیق کار کے پاس اپنی ایک ہی بات کی تمہید کیلئے مترادفات وتراکیب کا وسیع ذخیرہ ہے جو پورے حُسن کے ساتھ ان کی تخلیقات کا حصہ بنتا ہے۔

صوت وآہنگ وصدا ونغمہ وشعر وغنا کے روزِ اوّل کی اصل

سخن ، علم ، دانائی ، دانش ، فراست
خرد ، آگہی ، فہم ، حکمت

سبھی یقین وگماں ، حدود شعور وادراک و
گیان وعرفاں نقاب ابہام میں نہاں ہیں
یہاں پہ موہوم کچھ نہیں ہے

ان گنت بد باطن و بد سیرت و بے راہرو
شیطاں تراشے اور
قفس کے چھوٹے چھوٹے روزنوں سے
جنت الفردوس میں بھیجے،
یہ سب آفت، مصیبت، خستگی، رنج والم کی
آگ کے شعلوں کے پالے تھے،

"وہ ابنِ آدم ضعیف وخام وناتمام وشرمسار و
بدنما وناقص وشکستہ پا!"
"کدھر چلا گیا ہے وہ؟"
"کہاں ہے وہ؟"

یہ کیسا اُدق معجزہ ہے:
یہ فنِ لطیف وسلیم ودقیق وبلیغ وفصیح وجمیل و
کریم وملائم ہے،
اعلیٰ ہے، عُمدہ ہے،
زیبا ہے، رعنا ہے،
لیکن ورائے گمان ویقیں ہے:

"فسانہ کون ومکاں" کی شاعری ایک وسیع المطالعہ شخص کی شاعری ہے جو جدید تو ہے مگر قدیم سے جدا بھی نہیں یہ اُسلوب جدت میں بھی کلاسیکیت لیے ہوئے ہے۔

مگر
جب تم نہیں ہوتے
تو تہذیبِ زماں بھی وہ نہیں رہتی
مکان ولامکاں بھی وہ نہیں رہتے

وجودِ وقت گویا اضطراب وابتری وبدحواسی میں
در و دیوار ہست و بود سے ٹکراتا پھرتا ہے

یہ فرعونوں کی بستی ہے،
یہاں موسیٰ نہیں کوئی!
یہاں سب اپنے اپنے قید خانوں میں مقید ہیں:
یہاں خود سے نکلنے کا کہیں رستہ نہیں کوئی!

شارق جمال کی شاعری اپنے اندر بڑی شاعری کے تمام محاسن لیے ہوئے ہے جن میں زمینی حقائق بھی ہیں، ذکرِ حُسن جمال بھی ہے اور فلسفیانہ گہرائی بھی:

کچھ تذکرۂ حُسن ہے کچھ ذکرِ دو عالم
ہے طُرفہ تماشا مرا اُسلوب سخن بھی

....

کتاب کے آخری ورق تک پہنچتے ہوئے خود کو عجب تحیّر میں مبتلا پایا۔ کبھی نوجوانی میں ہرمن ہیسے کے ناول "سدھارتھ" نے یہ حیرت و اسرار کے در وا کیے تھے، اور اب اس شاعری نے اپنے حصار میں لے رکھا ہے۔

"فسانہ کون ومکاں" واقعی "فسانہ کون ومکاں" ہے

☆☆☆☆☆

حسین تخیلات کا شاعر... باقی احمد پوری

شاعری کو اگر جسم تصور کر لیا جائے تو اس کی روح تخیّل قرار پاتی ہے۔ کسی خیال، تصور، تجربے، مشاہدے، بات، حالت اور کیفیت کا ذہن میں آنا، دماغ میں سمانا اور قلبِ شاعر پر نازل ہونا تخیّل کہلاتا ہے۔ باقی احمد پوری کی غزلیہ شاعری کا زیادہ تر حصہ تخیّلات پر مبنی ہے اور ان میں حسن و جمال زیادہ ہے، اس لیے میں نے انھیں حسین تخیّلات کا شاعر قرار دیا ہے۔ شاعری وجدانی کیفیت کا نام ہے اور اِس کیفیت کے بغیر شاعری بے روح جسم کی طرح ہے، باقی صاحب کا فنِ شاعری یہ ہے کہ وہ اپنے دل میں آنے والے خیالات، ذہن میں سمانے والے تصورات، قلبِ حزیں پر نازل ہونے والے اِلقا، آمد ہونے والے اِلہام، تلخ و شیریں تجربات، شدید جذبات، نازک احساسات اور عمیق مشاہدات کو شاعری میں متشکل کر دیتے ہیں، اِن عناصر کو یوں شعری قالب میں ڈھال دینا اور منظوم پیکر عطا کر دینا ہی اصل شاعری ہے اور جو شاعر اِس فن میں جس قدر طاق ہوتا ہے اور محنتِ شاقہ، باریک بینی، یک سوئی، لگن و جستجو اور مہارت سے کام لیتا ہے، وہی بڑا شاعر کہلاتا ہے، اسی کا کلام سینہ بہ سینہ سفر کرتا ہے اور اسی کی شاعری قبولِ عام کا درجہ پاتی ہے۔ ایسی ہی شاعری آگے چل کر آفاقیت کی حامل ہوتی ہے۔ اِس میدانِ سخن کے شاہ سوار اور کارِ ادب کے ہنر مند شاعر باقی احمد پوری یہ کام انجام دینے میں بڑی حد تک کام یاب و کامران نظر آتے

شاعر علی شاعر

ہیں، اِس ضمن میں اُن کے تین شعر پیشِ خدمت ہیں:

ساری بستی میں فقط میرا ہی گھر ہے بے چراغ
تیرگی سے آپ کو میرا پتا مل جائے گا

.....

تُو نے بھی موسموں کی پذیرائی چھوڑ دی
اب شوقِ ماہ و سال مجھے بھی نہیں رہا

.....

مجھ سے بچھڑ کے وہ بھی پریشان تھا بہت
جس کی نظر میں کام یہ آسان تھا بہت

.....

غیر مرئی اشیا کو مرئی بنا دینا باقی صاحب نے تخیل سے سیکھا ہے۔ کیوں کہ تخیل ہی تمام انکشافات اور ایجادات کا مرکز و محور ہے۔ شاعری کے سارے دریا اِسی سرچشمے سے پھوٹتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاعرِ موصوف کی شاعری میں دریا کی سی روانی اور موجوں کی سی بے کرانی محسوس ہوتی ہے جس کے سبب اُن کا کلام سنتے ہی دل میں اُتر جانے کی صلاحیت کا حامل بن جاتا ہے اور اِسی خاصیت اور خوبی نے اُن کے کلام میں روانی، سلاست اور شعریت کو بھر دیا ہے۔ اُن کے کلام میں غنائیت کا ہونا، اُن کی طبیعت کی موزونیت کے سبب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا کلام سننے میں بھلا لگتا ہے اور کانوں میں رس گھولتا محسوس ہوتا ہے۔ سامعین پر ایک سحر طاری کر دیتا ہے اور قارئین بہت دیر تک اِس کے اثر سے خود کو نکال نہیں پاتے۔

باقی احمد پوری ایک سینئر شاعر ہیں جو اپنی عمدہ شاعری کے سبب جانے اور پہچانے جاتے ہیں، نہ اُن کے پاس کوئی عہدہ ہے، نہ کوئی سرکاری سپورٹ اور نہ ہی وافر مقدار میں مال و زر ہے کہ جس کی بنیاد پر لوگ اُن کو سراہیں یا اُن سے دوستیاں نبھائیں۔ یہ حقیقت ہے کہ عہدِ حاضر کا نقاد عہدہ پرستی، مالی منفعت، حکومتی اعزازات و اسناد اور نقد انعامات کے لالچ میں دوستیاں نبھاتے ہوئے ذرّے کو آفتاب اور آفتاب کو ذرّہ بنانے پر تلے ہیں اور اس کام میں وہ اپنی پوری صلاحیت صرف کر دیتے ہیں۔ یہ وجہ بھی ہے کہ باقی جیسے عبقری، کہنہ مشق اور زبان و بیان میں مہارت رکھنے اور انتہائی عمدہ کلام کہنے کے باوجود سرکاری و نیم سرکاری سطح پر وہ مقام اور نام نہ مل سکا جو اُن کا جائز حق تھا، وہ آج کے شاعر نہیں ہیں، ستر کی دہائی میں جن شعرائے اُردو کا نام اُبھر کر پاکستان کے ادبی منظر نامے پر آیا اور آج تک آسمانِ سخن پر وہ مہرِ منور کی طرح جگمگا رہے ہیں اُن میں باقی احمد پوری کا نام بھی شامل ہیں۔ باقی صاحب زود گو بھی ہیں اور اُنھیں شعر میں خیال کو سجا کر پیش کرنے میں ملکہ حاصل بھی ہے۔ اِس سلسلے میں اُن

کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

وحشت میں تار تار لبادہ نہیں کیا
اتنا بھی ہم نے عشق زیادہ نہیں کیا

.....

دشت و دریا کے یہ اُس پار کہاں تک جاتی
گھر کی دیوار تھی ، دیوار کہاں تک جاتی

.....

وہ ستم کر کے پشیماں نہیں ہونے والا
سخت کافر ہے مسلماں نہیں ہونے والا

.....

یہ بھی حقیقت ہے کہ باقی احمد پوری وسیع المطالعہ شاعر ہیں۔ اُن کی نظر سے تمام سکّہ بند اور کہنہ مشق شعرائے اُردو کا کلام گزرا ہے بلکہ وہ اپنے ہم عصر شعرا کے ساتھ ساتھ اپنے بعد آنے والے شعرا اور شاعرات کو بھی پڑھتے رہتے ہیں۔ اِس مطالعے کی عادت، سخن فہمی اور مشقِ سخن کے سبب وہ کلاسیک کی روح تک سے واقف ہو گئے، اور اُردو ادب عالیہ اُن کے مزاجِ شاعرانہ میں رچ بس گیا ہے۔ اُن کا خاندانی نام سید مقبول حُسین بخاری اور قلمی نام باقی احمد پوری ہے، وہ باقیؔ تخلص کرتے ہیں اور اکیس مارچ 1950ء کو احمد پور لمہ (ضلع رحیم یار خان) میں پیدا ہوئے، اُنھوں نے ڈپلومہ آف ایسوسی ایٹ میں میکینیکل انجینئر حاصل کیا اور بعد ازاں ایم اے اُردو پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے کیا۔ اُن کے اب تک مندرجہ ذیل گیارہ شعری مجموعے نہ صرف زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر آ چکے ہیں بلکہ قارئینِ شعر و سخن، ناقدینِ فن و ہنر اور مشاہیرِ اُردو ادب سے داد و تحسین بھی وصول کر چکے ہیں۔

فہرست گیارہ مجموعہ ہائے کلام:

۱- باقیات
۲- نقشِ باقی
۳- صدر رشکِ غزالاں
۴- اب شام نہیں ڈھلتی
۵- محبت ہم سفر میری
۶- غزل تم ہو
۷- اُداسی کم نہیں ہوتی
۸- اگر آنکھیں چھلک جائیں
۹- روانی
۱۰- ہمارا کیا ہے
۱۱- والہانہ

جس شاعر کی ملکیت میں اِس قدر شعری اثاثہ اور سرمایۂ سخن ہو، اُسے بھلا زبان و بیان کی نازکیوں کا شعور کیوں کر نہ ہوگا۔ باقی احمد پوری کو ہم جدید تو نہیں نیم جدید اُسلوب و فکر کے شعراء میں شمار کرتے ہیں۔ وہ نیم جدید اُسلوب و فکر کے ایسے ثقہ شاعر ہیں جن کی شاعرانہ خوبیوں کی روشنی میں نہ جانے کتنے تازہ کار اور نو آموز شاعر اپنی

شاعری کے چمن نکھار اور اُن کی سلجھی ہوئی اور مہذب و مؤدب محبت میں اپنی شاعرانہ اور ادبی شخصیت کو سنوار رہے ہیں۔ وہ صاحبِ اُسلوب شاعر ہیں، ادب میں اُن کا بڑا مقام ہے کیوں کہ اُن کے کلام میں فنی و فکری اور اُسلوبیاتی انفرادیت موجود ہے۔ اُن کے سرمایۂ سخن میں رموزِ حیات بھی بیان ہوئے ہیں اور اسرار کائنات بھی سموئے گئے ہیں۔

اُن کا ہر شعر اثر انگیزی کا شفاف آئینہ ہے اور شعری جمالیات سے مزین ہے۔ وہ باقاعدہ ترقی پسند شاعر تو نہیں ہیں، مگر اُن کے یہاں ترقی پسندانہ شاعرانہ شعور بھرپور توانائی کے ساتھ موجود ہے۔ اُنھوں نے کسی سے کسبِ فیض نہیں کیا ہے بلکہ وہ اپنے مزاجِ شاعرانہ کے مطابق اپنے اُسلوبِ شاعری کی راہ پر گامزن ہیں اور اُن کا یہ سفر تسلسل سے جاری ہے۔ اب تک اُن کے اعصاب تھکے اور نہ اُن کے قدم کہیں رُکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے گیارہ شعری مجموعوں پر مشتمل ''کلیاتِ باقی احمد پوری'' تیاری کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ اِس مواد سے جہاں دامنِ اُردو ادب مالامال ہو گیا وہاں اُردو ادب کے وقیع سرمائے میں اضافہ بھی ہوگا اور وہ تاریخِ اُردو ادب کا حصہ بھی بنے گا۔

اپنے دعووں کے دلائل میں شاعرِ موصوف کے چند شعر پیش کرتا ہوں:

یہ عشق ایک دشتِ پُر اسرار ہے میاں
اِس دشت میں مکان بناتا ہے کوئی کوئی

ذہن تھک جاتا ہے اِک یاد کو لکھتے لکھتے
چھوڑ کے لوح و قلم گھر سے نکل جاتے ہیں

اُس خوش بدن کی ایک ہی خواہش ہے رات دن
سارے جہاں میں اُس کی دہائی پڑی رہے

باقی احمد پوری فکر و خیال، زبان و بیان، اُسلوب تازہ اور شاعرانہ ہنرمندی کی صفات سے آراستہ ہیں۔ وہ شاعری کی معتبر اور ثقہ آوازوں میں شمار ہوتے ہیں۔

باقی احمد پوری قدامت پسند نہیں ہیں اور نہ وہ دقیانوسی سوچ کے مالک ہے بلکہ وہ دنیا کے موسموں کے ساتھ چلنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ عہدِ حاضر کے شعری تقاضوں کو پورا کرنے کی سعیِ بلیغ کرتے رہتے ہیں اِس لیے وہ کسی جدید، نام ور، سکہ بند اور کہنہ مشق شاعر سے کم نہیں ہیں۔ شاعرانہ حیثیت میں اُن کے ہم پلہ ہیں۔ وہ شدید جذبات، تلخ و شیریں تجربات اور عمیق مشاہدات کو منظوم کرنے پر مکمل دست رس رکھتے ہیں اور اپنے شعری آہنگ میں انفرادیت کے حامل ہیں۔ اُن کا مزاجِ

شاعرانہ تلاش وجستجو سے معمور ہے اِسی لیے اُن کا مزاجِ سخن اپنے معاصرین شعرا سے بڑی حد تک الگ نظر آتا ہے۔ ایک اچھے، کام یاب اور بڑے شاعر کے لیے جن شاعرانہ اوصاف کا ہونا لازمی ہے، وہ اُن میں بہ درجہ اتم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ہم عصر شعرا میں منفرد وممتاز نظر آتے ہیں۔

ویسے تو باقی احمد پوری کی شاعری علامت، تجرید اور ابہام و اہمال سے پاک ہے اور اُن کے اشعار کے تمام آئینے صاف و شفاف ہیں جن میں ہر عکس واضح نظر آتا ہے، مگر اُن کے کلام میں ایک علامت نظر آتی ہے جو ''پرندہ'' ہے۔ وہ پرندوں سے پیار بھی کرتے ہیں اور اُن کی طرح آزاد رہ کر زندگی گزارنا بھی چاہتے ہیں، مگر اُن کی بے بسی پر آنسو بھی بہاتے اور دکھ کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں کہ لوگ پرندوں کو قید کر لیتے ہیں، انھیں بال و پر سے محروم کر دیتے ہیں، اُن کی بھوک اور پیاس کا خیال نہیں رکھتے، دیگر جان دار انھیں بہ آسانی اپنا شکار بنا لیتے ہیں۔

وہ خود سے کہتے ہیں کہ تم کیسے شخص ہو کہ انسان ہو کر اپنے گھر کا راستہ بھول جاتے ہو جب کہ پرندے جانور ہو کر اپنا آشیانہ یاد رکھتے ہیں۔ وہ اُن پرندوں کی بات بھی کرتے ہیں جو خود بہ خود مکینوں سے مانوس ہو کر اُن کے مکانوں کی منڈیروں پر آ بیٹھتے ہیں۔ ایک جگہ تو شاعرِ موصوف نے خود کو پرندہ تصور کر کے شکوہ کیا ہے کہ ہم خود اُڑے نہیں ہیں، ہمیں اُڑایا گیا ہے، ہمیں ستایا گیا ہے۔ وہ اپنے محبوب کو صیاد مان کر بے کسی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم تمھارے جال میں آ گئے ہیں، اب بے بس و مجبور ہیں، تمھارے رحم و کرم پر ہیں، اب تم ہمیں پنجرے میں قید کرو یا ہمارے پر کاٹو، جو سلوک چاہو روا رکھو۔ وہ کہتے ہیں کہ ہوا چلتی ہے تو بچے کھیل سمجھ کر کاغذ کے بنائے ہوئے پرندوں کو اُڑاتے ہیں۔ وہ پرندوں کو شاخوں پر بیٹھا دیکھ کر کہتے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ پرندے بھی شجر کے ساتھ اُگائے گئے ہوں۔

شاعرِ موصوف کے تخیل کی بلندی پروازی ملاحظہ ہو: وہ کہتے ہیں کہ فلک پر لوگ جن کو ستارے خیال کر رہے ہیں وہ تو چاندنی میں نہاتے ہوئے پرندے ہیں، اِس لیے ستاروں کی طرح جگ مگ جگ مگ کرتے نظر آ رہے ہیں۔ پھر افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم جیسے پرندوں کے نصیب میں تو بلندیاں لکھی ہوتی ہیں، اور اگر ہم جیسے پرندے زمین پر ہیں تو ہمیں آسمان سے گرایا گیا ہے۔ پھر پرندوں کی وفاداری کا ذکر کرتے ہیں کہتے ہیں کہ ہمیں فکر نہیں ہے کہ ہمارے سدھائے پرندے ہمیشہ

ہمارے پاس ہی لوٹ کر آئیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو درخت تناور ہوتے ہیں وہ کبھی بھی پرندوں کو دکھ نہیں دیتے بلکہ اُنھیں ثمر، سایہ، پناہ اور آشیاں بخش دیتے ہیں۔

ایک جگہ تو باقی صاحب پرندوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

میں نے محبوب کے نام خط لکھ رکھا ہے، مگر تم
زبانی پیغام بھی لے جانا

مجھے محبوب کی یاد مصروف رکھتی ہیں، اے پرندو، میرے کام ادھورے رہ جاتے ہیں۔

پرندو، آج میرے ساتھ رہنا کیوں کہ بچھڑنے کے بعد محبوب سے ملنے کی پہلی شام ہے۔

اے پرندو، اُجلی دھوپ میرے گھر کا رستہ بھول گئی ہے، دن نکلتے ہی شام آجاتی ہے۔

اے پرندو، سب کو محبت کا انجام معلوم ہے پھر بھی یہ جذبہ دل میں سر اُٹھا لیتا ہے۔

اے پرندو، میرا ساتھ دو اُس ظالم محبوب کو میرے لیے رام کرو۔

یہ تشبیہات، یہ علامات اور یہ استعارات قابلِ ذکر ہی نہیں بلکہ قابلِ صد ستائش اور قابلِ داد بھی ہیں۔ میں باقی صاحب کی ایک غزل جس کی ردیف ''پرندے ہیں'' ہیں پیش کرنے پر خود کو مجبور پا رہا ہوں۔ اس غزل کو اُن کی نمایندہ غزل بھی کہیں تو بے جا نہ ہوگا، ملاحظہ ہو:

اُڑے نہیں ہیں، اُڑائے ہوئے پرندے ہیں
ہمیں نہ چھیڑ ستائے ہوئے پرندے ہیں
قفس میں قید کرو یا ہمارے پر کاٹو
تمھارے جال میں آئے ہوئے پرندے ہیں
ہوا چلے گی تو بچے اُڑائیں گے ان کو
یہ کاغذوں سے بنائے ہوئے پرندے ہیں
جمے ہوئے ہیں یہ شاخوں پہ اس طرح جیسے
شجر کے ساتھ اُگائے ہوئے پرندے ہیں
فلک پہ جن کو ستارے سمجھ رہے ہیں لوگ
وہ چاندنی میں نہائے ہوئے پرندے ہیں
بلندیاں ہیں ہمارے مزاج میں شامل
بلندیوں سے گرائے ہوئے پرندے ہیں
ہمارے پاس ہی آئیں گے لوٹ کر باقی
ہمارے جتنے سدھائے ہوئے پرندے ہیں

.....

کچھ نقاد چند مخصوص شعرا کو سہلِ ممتنع کا شاعر قرار دیتے ہیں حالاں کہ اُن کی تمام شاعری سہلِ ممتنع کے زمرے میں نہیں آتی، مگر پھر بھی وہ اپنا سارا زورِ تنقید اپنے ممدوح شعرا کا مذکورہ صنعتِ شاعری کا شاعر قرار دینے میں صرف کرتے رہتے ہیں پھر بھی لوگ اُن کے ممدوح شعرا کو سہلِ ممتنع کا شاعر نہیں مانتے۔ میں باقی صاحب کو سہلِ ممتنع کا شاعر تو قرار نہیں دے رہا مگر اُن کے کلام سے اچھا خاصا سرمایہ ایسا پیش کر سکتا ہوں جو سہلِ ممتنع کی عمدہ مثال میں

پیش کیا جا سکتا ہے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

پتھروں سے جڑے ہوئے شیشے
پتھروں سے بھی سخت ہوتے ہیں

.....

میں کسی بحث میں نہیں پڑتا
جاؤ بابا مجھے معاف کرو

.....

وہ ایسے ڈھونڈنے نکلے ہیں باقی
محبت جیسے رستے میں پڑی ہے

.....

یاد کرتے نہیں ہیں وہ ہم کو
بھول سکتے نہیں ہیں ہم صاحب

.....

شہر جنگل سے کم نہیں لگتا
آدمی جانور بنے ہوئے ہیں

.....

وہ کہاں سب کے ہاتھ آتا ہے
زور تو اپنا سب لگاتے ہیں

جس طرح چمن میں بہت سے پھول کھلتے ہیں اور سب اپنی اپنی بہار دکھا رہے ہوتے ہیں، اُن تمام پھولوں کی بناوٹ اور ساخت الگ ہوتی ہے، وہ رنگ و نکہت اور نور کی بنا پر مختلف ہوتے ہیں، اُن کی خوش بوئیں مختلف ہوتی ہیں، اُن کے اثرات مختلف ہوتے ہیں، اِسی طرح چمنِ شاعری اور گلزارِ سخن میں بھی مختلف النوع اشعار کے پھول کھلتے ہیں جو دنیائے اُردو ادب کو اپنی بھینی بھینی خوش بو سے مہکائے رکھتے ہیں، اُن اشعار کی بناوٹ، ساخت، اثر آفرینی، مضمون آفرینی، مختلف ہوتی ہے، اُن میں خیال کی ندرت، تخیل کی بلند پروازی، سوچ کی وسعت اور فکر کی گہرائی مختلف ہوتی ہے، جس طرح ہر پھول کی پتیاں، اُس کی تراش خراش، پیراہنِ رنگ و بو دیدہ زیب اور اثر آفرین ہوتا ہے، اِسی طرح ہر شعر کی تاثیر جدا جدا ہوتی ہے، مگر چمن کے تمام پھولوں میں گلاب کو جو عزت و مقام اور شہرت حاصل ہے وہ دوسرے کسی پھول کو نہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ باقی احمد پوری کے اشعار چمنِ شاعری اور گلزارِ سخن کے وہ پھول ہیں جو تمام کے تمام گلاب کی مماثلت رکھتے ہیں۔ اُن کی خوش بو اور پھولوں سے منفرد ہوتی ہے اور رنگ بھی دیگر پھولوں سے الگ نظر آتا ہے، اُن کی خوش نمائی اور بناوٹ و ساخت بھی تمام پھولوں سے عمدہ اور دل کش ہوتی ہے۔ میں یہ کہنے میں حق بہ جانب ہوں کہ باقی صاحب کی شاعری ہزاروں شعرائے اُردو سے بہتر اور اچھی ہے، اُن کے سیکڑوں ہم عصر اُن سے پیچھے صرف اِس لیے رہ گئے ہیں کہ وہ اپنے کار ادب سے سنجیدہ نہ رہ سکے۔

مندرجہ ذیل اشعار سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اُن اور اُن کے ہم عصر شعرا کے کلام میں زمین و آسمان کا فرق ہے:

خاموش چاہتوں کی مہک اُس طرف بھی ہے
جو میرے دل میں ہے وہ کسک اُس طرف بھی ہے

.....

مرے بازارِ حسرت میں یہی اِک چیز ہے باقی
یہاں کچھ خواب رکھے ہیں، وہاں کچھ خواب رکھے ہیں

.....

زندگی کے کارواں پر کچھ اثر پڑتا نہیں
اِک مسافر کھو گیا تو دوسرا مل جائے گا

.....

باقی صاحب نے اس دشتِ پُرخار اور راہِ دشوار گزار کا سفر بغیر تھکے اور بغیر رُکے کیا ہے۔ وہ آج بھی اِس دشت کی سیّاحی میں مصروف عمل ہیں۔ کیسا بھی کٹھن موسم ہو، ابر و باد و باراں ہو، پیروں میں آبلے پڑ چکے ہوں یا مسافت کی تھکن آڑے آ رہی ہو، اپنوں کے ناروا رویے، دوستوں کی بدسلوکیاں اور قسمت کی بدنصیبیوں کو جھیل کر وہ اپنی منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں اور زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج نہ صرف پاکستان بلکہ ہندوستان اور دنیا بھر میں اُردو کی نئی بستیوں کے مکین اُن کی شاعری کے گرویدہ ہیں۔ جس طرح خوش بو کو بکھرنے، روشنی کو پھیلنے اور سورج کو نکلنے سے کوئی نہیں روک سکتا، اِسی طرح باقی احمد پوری کے جیسی اچھی شاعری، عمدہ خیال، اور تخیل کی بلند پروازی کے راستے میں کوئی حائل نہیں ہو سکتا۔ وہ مسلسل سفر اختیار کیے ہوئے ہیں اور منزل بہ منزل طے کرتے ہوئے منزلِ مقصود کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اِس راستے اور سفر میں نہ اُنھیں رہبری کی رہبری سے غرض ہے اور نہ اُنھیں اہلِ کارواں کے ساتھ اور جرس کی آواز کا انتظار ہے۔ وہ اپنا سفر خود طے کیے جا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ منزل معراجِ فن پر پہنچ چکے ہیں جہاں سے اُنھیں اپنی محنتِ شاقہ، باریک بینی، یک سوئی اور لگن و جستجو کا صلہ ملتا نظر آ رہا ہے۔ میں اِس باہمت اور حسین تخلیقات کے شاعر کو دلی مبارک باد دیتا ہوں اور اُن کی ہمتِ مردانہ کی داد دیتے ہوئے اُن کی عظمتِ شاعرانہ کو سلام پیش کرتا ہوں۔ چند اشعار پیش کر کے اجازت چاہوں گا:

عمر بھر کون رہے ابرِ کرم کا محتاج
داغ دل اشکوں سے دھو لیں گے ہمارا کیا ہے

.....

بے خواب سرخ آنکھوں نے سب کچھ بتا دیا
کل رات دل میں درد کا طوفان تھا بہت

.....

باقی میں اپنے فن سے بڑا پُر خلوص ہوں
اس واسطے زوال مجھے بھی نہیں رہا

☆☆☆☆☆

روشنی کا سفر

سحر کہ جس کی تمنا ہے زندگی اپنی
ہماری زندہ اکائی نہ منقسم ہوگی

کہیں سے ڈھونڈ کے لائیں تو کوئی بات بنے
ہم ایک ہو کے جئیں گے تو سرخرو ہوں گے

وہ خواب خواب اجالا جو ہم نے دیکھا تھا
اسی پیام اسی حرف معتبر کی قسم

اسے بھی کاش ملے پیرہن حقیقت کا
ازل سے تا بہ ابد ہے یہ روشنی کا سفر

یہ سرزمیں کہ ہے قائد کی آرزو کا جہاں
اسی زمیں کی فضا نے ہمیں اجالا ہے

یہاں بہار کے خیمے ہمیشہ نصب رہیں
ہماری فکر و نظر کا یہی حوالہ ہے

وہ اک پیام کہ رزق ہوا نہ ہو جائے

یہی پیام امانت ہے اپنے قائد کی

کوئی لبادۂ مذہب نہ اوڑھ کر نکلے

کسی کو فتویٔ تکفیر کی نہ جرأت ہو

کسی کے چہرے پہ غازہ نہ ہو تعصب کا

کوئی نہ فخر کرے رنگ و نسل پر اپنے

یہ سوہنی دھرتی ہماری، ہم اس کے رکھوالے

کہ ہم ہیں اول و آخر اسی زمیں کے لیے

عدو کو ضد ہے کہ ٹکڑوں میں بانٹ دے ہم کو

ہمارا عزم تشخص کہ ہم موحد ہیں

حسن عسکری کاظمی

نظمانے

ریت پر چھت کھڑی نہیں ہوتی
دل میں مقصد بڑا نہ ہو تو پھر
کوئی منزل بڑی نہیں ہوتی

.....

اب مسیحا کو کون سمجھائے
سُن لے بیمار کو توجہ سے
اُس کا آدھا مرض چلا جائے

.....

اتنی ذلت کے بعد بھی نہ ہُوا
بارہا وقت نے دیا لیکن
کیا سبق تھا کہ یاد بھی نہ ہُوا

.....

ہے کوئی بات جو نہیں کہتے
شرم آنکھوں کی مار دیتی ہے
ورنہ ہم لوگ چُپ نہیں رہتے

.....

وقت اُلٹی طرف نہیں بہتا
دل اگر پاس پاس ہو جائیں
فاصلہ، فاصلہ نہیں رہتا

.....

کوئی رستہ بھی ہو نہ بچنے کا
اور دشمن پڑا ہو قدموں میں
تب مزا ہے معاف کرنے کا

چاہتا ہو کسی کا دل کچھ بھی
رُت ہو کوئی بدل ہی جاتی ہے
کب یہاں پر ہے مستقل کچھ بھی

.....

ٹھیک ہوتا نہیں ہر اندازہ
کوئی موقع اگر نہ دے دستک
دیکھ لیجے، بدل کے دروازہ

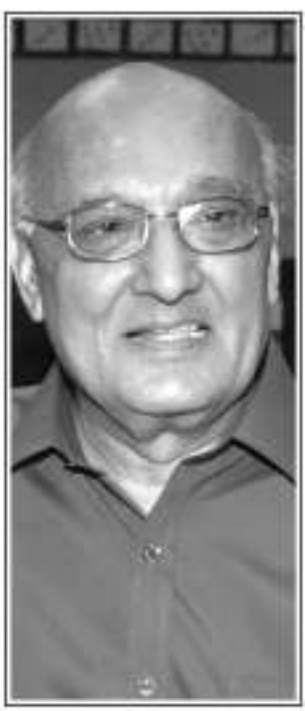

امجد اسلام امجد

ابھی کل کی بات ہے

[تیز دھوپ میں ایک خواب آلود خود کلامی]

رونق تھی بے حساب ابھی کل کی بات ہے
ہر شے تھی لاجواب ابھی کل کی بات ہے

اب جو ہے بے نشان سے ٹکڑوں کی شکل میں
تھا اک حسین خواب ابھی کل کی بات ہے

آنکھوں میں خواب، ذہن میں بے تاب جستجو
اور دل میں اضطراب ابھی کل کی بات ہے

جس کے پیامِ خیر کے ہم داعیوں میں تھے
وہ اُمِ انقلاب ابھی کل کی بات ہے

اب تو ہمیں خود آپ بھی آتا نہیں یقیں
چڑیاں تھیں یہ عقاب، ابھی کل کی بات ہے

اب جو دعائیں پھرتی ہیں گلیوں میں در بدر
ہوتی تھیں مستجاب ابھی کل کی بات ہے

شام و سحر کے سب سے کٹھن امتحان میں
ہم ہی تھے کامیاب ابھی کل کی بات ہے

طاقوں میں جو تپاک سے اب ہے دھری ہوئی
دل میں تھی یہ کتاب ابھی کل کی بات ہے

اب ہے جہاں پہ دھول وہاں کھل رہے تھے پھول
دریا تھے یہ سراب، ابھی کل کی بات ہے

ہر اک کو تھی تلاش کہ ہے خوب تر کہاں
کچھ بھی نہ تھا خراب ابھی کل کی بات ہے

علم و ہنر کے، جرأتِ تحقیق کے یہاں
روشن تھے آفتاب ابھی کل کی بات ہے

اب جس چمن میں رنگ کا سایا نہیں، وہاں
خوشبو تھی بے حساب ابھی کل کی بات ہے

دنیا کے طول و عرض میں جاتی تھی بازگشت
ہوتا تھا جب خطاب ابھی کل کی بات ہے

ہر ہر کمال ہم سے، یہی نکتہ چین لوگ
کرتے تھے انتساب ابھی کل کی بات ہے

امجد اب اس خمار سے نکلیں کہ دہر میں
"ہم ہی تھے انتخاب" ابھی کل کی بات ہے

امجد اسلام امجد

وقت آ گیا ہے

زمانے!
مرے لفظ جگنو بنیں
اور گلِ گفتگو جب کھِلے
اُس پہ تتلی جُھکے
میرے ہونٹوں پہ خوشبو رہے
میرے آنسو ستاروں کی مانند چمکیں
مرے دل کے دریا کنارے
پرندے نہائیں
ترے گیت گائیں
گلابی اُفق پر
گذرتی ہُوئی شام
ہلکے سلیٹی لبادے میں ملبوس
بادل کے ہمراہ
پکنک پہ نکلی ہُوئی ہے
سمندر کنارے پہ
اِک سرخ چھتری تلے
زندگی نیم عریاں پڑی ہے
خمیدہ کمر والے بوڑھے کی
برفاب آنکھوں میں
جلتی ہُوئی آگ
چھتری کے نیچے پڑی لاش کو
اپنی خواہش کے تابوت میں رکھ رہی ہے
حیات آشنا موت کو چکھ رہی ہے
پرندوں کے گیلے پروں میں
ہوس چیونٹیاں رینگنے لگ گئی ہیں
نگاہوں میں جلتے ستارے بجھے جا رہے ہیں
مرے ہونٹ خوشبو سے خالی ہُوئے جا رہے ہیں
گلِ گفتگو جیسے مرجھا گیا ہے
مرے باغ ہستی سے جانے کا وقت آ گیا ہے!

خاور اعجاز

نظم

[بیادِ خالد احمد]

(نعمان منظور کی کتاب ''خطوطِ نم'' پڑھنے کے بعد نعمان منظور کے نام ایک نظم)

''خطوطِ نم'' بہ چشمِ نم پڑھے ہیں
کہ ایسے نوحے پہلے کم پڑھے ہیں
تمہارے درد کے موسم پڑھے ہیں
''خطوطِ نم'' بہ چشمِ نم پڑھے ہیں
یوں جیسے بیٹھ کر باہم پڑھے ہیں
''خطوطِ نم'' بہ چشمِ نم پڑھے ہیں
تمہارے دل کے سارے غم پڑھے ہیں
''خطوطِ نم'' بہ چشمِ نم پڑھے ہیں
حروفِ نوحہ و ماتم پڑھے ہیں
''خطوطِ نم'' بہ چشمِ نم پڑھے ہیں
ہماری چشمِ گریاں کو تو دیکھو!
''خطوطِ نم'' بہ چشمِ نم پڑھے ہیں
خدارا اَور مت ہم کو رُلاؤ!
''خطوطِ نم'' بہ چشمِ نم پڑھے ہیں
لکھے ہیں تم نے اپنے آنسوؤں سے
''خطوطِ نم'' بہ چشمِ نم پڑھے ہیں
دُعائے صبر ہے نعمان منظور
''خطوطِ نم'' بہ چشمِ نم پڑھے ہیں
نسیم امشب بیادِ خالد احمد
''خطوطِ نم'' بہ چشمِ نم پڑھے ہیں

نسیمِ سحر

اے اجل

اے اجل
یہ تو ممکن نہیں
تیری آنکھیں نہ ہوں
سوچ فکر و تدبر سے عاری ہو تو
پھر بھی محسوس اکثر ہوا ہے یہی
تو نہیں دیکھتی تو نہیں سوچتی
کوئی سادھو ولی ہو
جہاں دار ہو
طفلِ کمسن جواں ہو
کہ ہو سال خوردہ کوئی
نیک ہو بد ہو
ظالم ہو یا مہرباں
تو نہیں سوچتی تو نہیں دیکھتی
کم سے کم
اس قدر تو تجھے
دیکھنا چاہیے
کس کی ہستی شجر کی طرح
دھوپ کے سامنے
کسے لوگوں کی خاطر بنی سائباں
کس نے پیاسوں کا
ہمدرد بن کے
مدارات کے چشمے جاری کیے
کس نے کانٹے اُگائے سدا
کشتِ امکان میں
راہ گیروں کے پیروں کو زخمی کیا
پانیوں پر لگاتار ہا
کون پہرے
کہ جس کے نتیجے میں
مخلوق پیاسی رہی
کتنی مہلت ہے کس کے لیے
کچھ نہ کچھ تجھ کو یہ سوچنا چاہیے

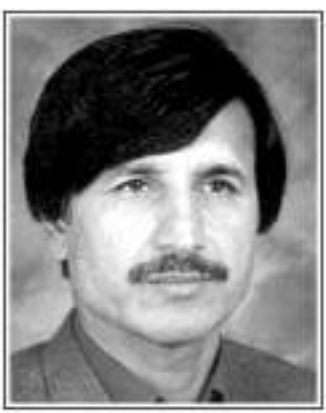

گلزار بخاری

نظم

پسر زادے
ذرا کچھ اور تیزی سے
جواں ہو کر دکھاؤ
اور دنیا کے بڑے لوگوں میں
اپنا نام پیدا کر کے آؤ
تا کہ اس جھکتی کمر کو
پھر اٹھا کر
میں تمہارے قد و قامت کے سہارے
اب ذرا سی سرکشی کے ساتھ
کچھ دن اور زندہ رہ سکوں

نظم

سمجھتا ہوں
کہ مجھ سے شہر میں
جتنے بھی لوگ اب تک
بہت ناراض ہیں
میں بے زباں
چپ چاپ رہتا ہوں
وہ سب
میری بلند آواز ہیں

نظم

خواہشیں
شہر کی تنگ سڑکوں پہ
شام و سحر دوڑتی بھاگتی
اس ٹریفک کی مانند ہیں
جو کسی حادثے میں
مری موت کے بعد بھی
روز و شب یونہی
جاری و ساری رہے گی

صفدر صدیق رضی

اور کہانی اَسیری میں ہے وقت کی

اسلام عظمی

دیکھ کر آئینہ ٹوٹتا میں بھی ہوں
آئینہ جو کبھی جھوٹ لکھتا نہیں
آئینہ عکس گر..... مجھ سے کہتا ہے یہ، رقص کر، رقص کر
خال و خد..... بہتے پانی کی تحریر ہیں
یہ رواں پانیوں پر لکھے بلبلے عارضی ہیں خوشی
دن جوانی کے ہوں، خوش کہانی کے ہوں
سب گزر جاتے ہیں
دیکھ کر خال و خد ٹوٹتے تم جو ہو
تلملاتے ہوئے بھول جاتے ہو تم
ہر کہانی اَسیری میں ہے وقت کی
وقت جامد نہیں، یہ روانی ہے اِک، یہ تسلسل ہے اِک
تم ابھی تک جو ہو، کیا یہ کافی نہیں!
ہر کہانی اسیری میں ہے وقت کے
آخری وقت تک، رقص کر، رقص کر
یاد رکھ..... ہر کہانی اسیری میں ہے وقت کی

نیچے کون جائے ..... !!

رات کے بارہ.....نہیں!..... شاید!
گھڑی کی سوئیاں اک دوسرے سے
چند لمحوں کی مسافت پر کھڑی ہیں
سیڑھیوں کے ساتھ کمرے میں
دھواں سا بھر گیا ہے
میز پر سگرٹ کے پیکٹ میں فقط،
اک آخری سگرٹ بچا تھا،
وہ بھی اب سلگا لیا ہے
تیسری منزل سے نیچے سب دکانیں بند ہیں
اور سر کے اوپر، چھت پہ خالی آسماں ہے
رات لمبی رات ہے،
سرمازدہ بستر میں ویرانی بچھی ہے
آخری سگرٹ بھی آخر .....آخری ہے
ہاتھ کی پوروں میں جلتی راکھ بھرتی جا رہی ہے
اور سینے میں کہیں دل کی جگہ دھڑکا لگا ہے
سیڑھیوں کے ساتھ والا پورا کمرہ
زلزلے سے کانپ اُٹھا ہے
یا نظر کے زاویے بہکے ہوئے ہیں
آخری سگرٹ کے بجھنے تک
کہیں کچھ دُور، کوئی اک دکاں
کھلنے کا امکاں بھی اگر ہو
تیسری منزل سے نیچے کون جائے.....!!

خالد علیم

لکن میٹی

ابھی ابھی ہم سارے یہاں پر
'لکن میٹی' کھیل رہے تھے
''لُک چُھپ جانا، مکئی دادانا۔۔۔۔!''
گونجتی ہے آواز تمہاری
شام کی اس پیلے دالان سے
یا شاید میرے وجدان میں!
میں چھپ جاتا ہوں
ملگجے سے اک دروازے کی اوٹ میں
جانے کس مشکل ہے!
اور تم ڈھونڈ نکالتے ہو مجھ کو کتنی آسانی سے
ہاں، اب میری باری ہے
''لُک چُھپ جانا، مکئی دادانا۔۔۔۔!''
شام اچانک گہری ہونے لگتی ہے
میں آواز تمہیں دیتا ہوں
سیلن بھری ڈیوڑھی
پگلی کھڑکیوں سے چھنتی تاریکی
اجڑے مکاں کے ٹوٹے پھوٹے سائے میں
کون دریچے کے پیچھے تم آج چھپے ہو؟
ساری بیلی اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں
خوف انجانا مجھے ڈرانے لگتا ہے
''بس اب بند کرو اس کھیل کو۔ باہر نکلو!''
میں روہانسا کہتا ہوں
خاموشی ہے۔۔۔اور میں اوپر تکتا ہوں
دُور فلک سے
شاخِ شفق سے
کاسنی پتے، لمحہ لمحہ جھڑنے لگتے ہیں
آسمان کے کونے کالے پڑنے لگتے ہیں
رات بکھرتی دھند کی صورت چھانے لگتی ہے
تنہائی کے خوف کو بھی نیند آنے لگتی ہے

حامد یزدانی

جہالت کی کھیتی!

فراغت کی چلمن سے لپٹی اداسی
جو ساکن خموشی میں صوتی ردھم ڈھونڈتی ہے
سماعت کے در پر
صداؤں کی دستک نے
خوابوں کو توڑا
تو آنکھوں نے سب نیندیں
بیزار لمحوں کی آتش میں جھونکیں
اچانک سے بیدار ہونے کا ناٹک رچایا
کہ اذنِ تکلم کو ترسی زبانوں پہ
کانٹے پڑے ہیں
گماں ہے
گیانی نے جب آبِ گریہ سے
قُفلِ فراست کو دھویا
تو دیکھا کہ دانش کی کنجی لگی ہے
سوالوں کے زنداں میں
قیدی کبوتر بھی پر جھاڑتے ہیں
کہ وہ بھی جوابوں کا چوگا چنیں
یوں ہے پر تخمِ عرفان
دیمک زدہ ہے
جہالت کی کھیتی ہری ہے
جہاں جھاڑیوں میں چھپے سانپ
ڈسنے کو تیار ہیں!

علی اصغر عباس

پیام میرا ملا تو ہوگا

ہوا کے کومل سُبک بدن پر
جو چاند کرنوں سے لکھ کے بھیجا
پیام میرا ملا تو ہوگا؟
میں آنے والے ہر ایک جھونکے سے پوچھتی ہوں
جواب لائے؟
مگر وہ نظریں چُرا کے ایسے نکل گئے ہیں
کہ جس طرح سے کوئی تو نگر
کسی شناسائے بے نوا سے
نظر بچا کے بدل لے رستہ

فرحت پروین

آخری بُت

تجھ کو دفنا کے ابھی آئی ہوں
تیرا استھان کہ اونچا تھا ___ بہت اُونچا تھا
گر کے تُو چُور ہوا ہے ایسے
بڑی مشکل سے سمیٹے ترے ریزے میں نے
اور بڑے کرب سے دفنایا ہے
گرد حیرت سے اَٹے چہرے پر
تہہ بہ تہہ دُکھ بھی ہیں مایوسی بھی
جلتے صحراؤں میں آنکھوں کی مرے
اَن گنت اُلجھے سوالوں کے بگولے رقصاں
ریت کے ذرّے نہیں یہ میں ہوں
میرا ایقانِ شکستہ مری اُمیدیں ہیں
تُو کہ تھا آخری بُت میرے صنم خانے کا
تجھ کو دفنا کے ابھی آئی ہوں

..... چراغ تعبیر معتبر .....

ابھی فضاؤں میں
خواہشوں کے مسرتوں کے حسین بادل
لطیف فردا کی کوکھ میں تھے
ابھی بہاروں کے رنگ سارے چمن میں پنہاں
نئی رُتوں کے پیامبر تھے
ابھی پرندے سفر کی جانب اُڑے نہیں تھے
ابھی سمندر محبتوں کے بھی پُرسکوں تھے
ابھی خیالوں کی دلکشی میں وہ خواب تعبیر
بن رہے تھے
کہ جن کی تعبیر مُعتبر تھی
نئے ستاروں کی رہگذر تھی
ابھی وفاؤں کے گلستاں میں
خزاں کا کوئی نشاں نہیں تھا
تو پھر یہ کس نے سکوں کے آنگن میں
تیرگی کا غُبار چھوڑا
اُداسیوں کا لباس اوڑھا!
یہ میں نے دیکھا
مہکتے پھولوں کی تیز خوشبو بکھر کے جیسے سمٹ گئی ہو
کسی سے جا کر چمٹ گئی ہو
یہ میں نے دیکھا
کہ آندھیوں نے تمام آنگن اُجاڑ ڈالے
وہ خواب چہرے کہ جن میں تازہ لہو تھا
جذبوں کی منزلوں کا
نئے دنوں کی جواں رُتوں کے
ابھی وہ پتے جو شاخِ اُمّیدِ مُعتبر پر
بہار اپنی دکھا نہ پائے
جو اَب لہو ہیں گئے دنوں کا
وہ مسکراتے گلاب چہرے
حسین چہرے، وہ خواب چہرے
جو گلستاں تھے، جو نوجواں تھے

جو اپنی دھرتی کی پیاسی مٹی کی پاسبانی میں
ایسے ڈوبے کہ مر کے نکلے
جنھیں زمیں نے نگل لیا ہے
مگر خلاؤں کی وسعتوں میں
انھی ستاروں کی روشنی ہے
اُداس شاموں کی تیرگی ہے،
اُداس لمحوں کی بے بسی ہے
گئے سمے کے اُن آنگنوں میں
گلاب چہروں کی زندگی ہے
جواں دماغوں کی قربتوں کی
خلوص و مہر و مراسمِ ربطِ دائمی کی
حسین یادوں کے فکر سورج کی روشنی ہے
اُداس شاموں، نڈھال صبحوں!
طویل دُکھ کی ہر ایک شب میں
گئے دنوں میں کئے ہوئے
اُن رفاقتوں کی نئی سحر کے وہ عہد و پیماں
جو صدق و اخلاص کی متاعِ گراں بہا تھے
جو آنے والے دنوں کی منزل کا راستہ تھے
انھی پہ چلنے کا عہد تابندہ تر جواں ہے
وہ قہقہے اب نئی رُتوں کے پیامبر ہیں
جو مہر و اخلاص و دوستی کی مہکتی یادوں کی رہگذر پر
جمالِ کشمیر کی شفق کو بڑھا رہے ہیں
جہاں کو جینا سکھا رہے ہیں
رہِ وفا میں یہی تو اثبات کا ہنر ہیں
چراغِ تعبیرِ مُعتبر ہیں، چراغِ تعبیرِ مُعتبر ہیں

فرحت عباس

غزل کے رنگ سچّے ہیں

[شکیب جلالی کے ایک نظم]

اُسے ہر شعر میں
اپنے تخیل کو
نئے مفہوم سے
آراستہ کرنے کا یارا تھا
وہ اک ایسا ستارا تھا
کہ جس کی روشنی میں
اک صدی کے بعد بھی
کرنیں اُبھرنی تھیں
غزل کو تازگی کے حسن سے
اُس نے نوازا تھا
بہت سے زخم تھے
جو ذہن کی بھٹی میں ڈالے
تو نئے اشعار نکلے تھے
جو اُس کی روح تک پھیلے ہوئے
ہر کرب کا اظہار نکلے تھے
اُسی نے اس شکستہ زندگی میں
بوجھ برسوں کا اُٹھایا تھا
بدن سے روح تک
اک دھوپ تھی
سر پر نہ سایا تھا
کسی کمزور لمحے میں
وہ اپنی زندگی کو
ریل کی پٹڑی پہ رکھ آیا
بدن کی نرمیوں کو
کس قدر سختی پہ رکھ آیا
وہ اک فنکار تھا
جس کا سخن صدیوں پہ پھیلا تھا
نہ جانے کس کی نظریں کھا گئیں
میرے سخنور کو
زمانے یاد رکھیں گے
شکیب آیا تھا پل بھر کو
مگر ان مٹ نقوش اپنے
ادب کو اُس نے بخشے ہیں
غزل کے رنگ سچّے ہیں

محمد نوید مرزا

محبت کا انسائیکلو پیڈیا

[نثری نظم]

محبت
چکنی مٹی کا برتن نہیں
جسے تم
کسی چورگلی میں پھینک آؤ گے

محبت
موٹر بائیک کی ہیڈ لائٹ کا کمزور شیشہ نہیں
جسے تمھاری
نرم و نازک کلائی کا زخم
کچھ یاد دلائے گا

محبت
خوب رو حسینہ کے خدوخال نہیں
موبائل فون پہ خاموشی کی آواز نہیں
وعدوں کی کشتی میں
بیٹھ کر
سمندری جھاگ سے الجھنے کا نام نہیں

محبت
سوتے جاگتے کی کیفیت میں
پرانی ڈائری کو دیکھنے
کچھ تصویروں کا بوسہ لینے
اور کچھ خوابوں کے جل جانے کی کہانی ہے

محبت
دل کی خوشی
اطمینان کی آکسیجن ہے
یہ کاروباری پیمائش، نمائش نہیں
محبت زمین پہ
انسان کی آخری کوشش ہے
جسے زوال کے بھوت چھو نہیں سکتے

امجد بابر

محسنِ پاکستان کی نذر

بہت سہمی ہوئی تھی قوم میری
دھماکے ایٹمی سن کر
عجب سکتے میں بیٹھی تھی
یہ ستر کی دہائی تھی
کہ سرحد پار سے ایٹم کھلا تھا
کچھ ایسی دھمکیاں اپنی زمیں کو مل چکی تھیں
وطن جانے کا خطرہ ہو گیا تھا
کوئی انجان سا دھڑکا لگا تھا

تبھی یورپ سے اک حب الوطن آئے
کہ بعد از قائداعظم
نیا احسان جو اس سرزمینِ پاک پر اترا
تو وہ احسان ہے ان کا
وطن کی خاک کو جو مانتے تھے
ہمیشہ کی طرح اپنا بچھونا

کسی جاگیر کے، سرے محل کے، جاتی امراء کے
کسی سطوت گزیدہ گوشہ نخوت سے نہ ان کا تعلق تھا
نہ ایسا کوئی ناطہ تھا۔
تبھی محسن وہ کہلائے
تجربہ گاہ میں ایٹم کو کھولا
وہ ایٹم جو حفاظت بُن رہا تھا
حفاظت بُننے والا
اک قلندر، ایک صوفی تھا
ستائش کی کسی خواہش سے بالا
خلائق کے لئے حاضر ہوا تھا

جسے اہلِ وطن دھڑکن بنا کر دل میں رکھتے تھے
ثناء ہر آن کرتے تھے

مگر افسوس کہ جب کام نکلا
انہیں اہل سیاست نے نظر بندی کی
جھاڑی میں چھپا کر

فرخندہ شمیم

یہ دنیا کو بتا ڈالا

کہ محسن مار کا چہرہ

یہ دیکھو ہم سا ہوتا ہے

فقط اک ننگ ہوتا ہے

سنو!

وہ محسنِ ارضِ خدائے لم یزل

فقط تخلیقِ ایٹم بم برائے ہم وطن نہ تھے

فقط ذہنِ رسا نہ تھے

فقط اہلِ قلم نہ تھے

حقیقت میں وہ برتر تھے

جو خود کو اولیاء کے پاؤں کا صدقہ سمجھتے تھے

وہ صوفی تھے!

وجد ایقان کرتے تھے

زمیں پر بیٹھ کر قصے فلک کے عام کرتے تھے!

وہ محسن تھے

زمینِ پاک پر احسان کرتے تھے

خدا کردہ! ہمیشہ آبرو ہوں

خدا کردہ! ارم میں سرخرو ہوں۔

نظم

شاہنواز زیدی

آج اتوار ہے
آج پہلی دفعہ وہ مجھے دھوپ میں لائے ہیں
آج پہلی دفعہ دنگ ہوں دیکھ کر
آسماں
کتنا شفاف ہے
کتنا نیلا ہے
اور اسقدر دور ہے!
میں کھڑا رہ گیا ہوں وہیں کا وہیں
دل عجب سی عقیدت سے معمور ہے
پھر میں دیوار زنداں کے سائے میں مٹی پہ بیٹھا
تو بیٹھا ہوا ہوں.....
کس کو پروا ہے اب
اس سمندر کی موجوں کی
میں جن پہ بہنے کو بیتاب تھا
اپنی آزادی کی
اپنی بیوی کی
یا اپنے آدرش کی
سب بہت دور ہے
بس یہ سورج، یہ مٹی، یہ میں
یہ گھڑی کتنی پر کیف ہے
کتنی مسرور ہے

بھوک

بھوک آخری حد تک خود اذیتی میرے
دل میں پھلنے دیتی ہوں ساتھ ساتھ رہتی ہے
اور آخر شب تک آنکھ اشک بھر کر بھی
جسم جلنے دیتی ہوں خالی ہاتھ رہتی ہے

اپنی پیاس کا لمحہ بیت
جانے دیتی ہوں
آب وصل ، کب اپنے
پاس آنے دیتی ہوں

کچھ عجب طریقہ ہے
جاگتے میں سونے کا
خواب اک سلیقہ ہے
کھو کے بھی نہ کھونے کا

میں بھری دکانوں میں
ڈوب ڈوب جاتی ہوں
واپسی پہ ہاتھوں کو
اور خالی پاتی ہوں

رخشندہ نوید

کچھ خواب سے ہیں

لبِ خاموش پر لفظوں کے طائر
اُڑانوں کے لیے پَر تولتے ہیں
سکوتِ شوق کی زنجیر پہنے
دِلوں کی رہگذر میں بولتے ہیں

کھلے قُفلِ تذبذب گفتگو ہو
کلید ایسی کوئی ملتی نہیں ہے
گُلِ اِقرار کے کھلنے کی ساعت
پسِ گلشن کہیں کھلتی نہیں ہے

قدم اُٹھ کر تری جانب نہ اُٹھے
میں پیاسی ہی لبِ دریا سے آئی
محبت میں انا ہوتی نہیں ہے
تجھے کیا خود کو بھی سمجھا نہ پائی

ہمیں اِک دوسرے کی سب خبر ہے
مگر اظہار ہم کرتے نہیں ہیں
پسِ سطرِ مژہ کچھ خواب سے ہیں
مگر اِقرار ہم کرتے نہیں ہیں

رخشندہ نوید

نظم

دھوپ میں مجھ پہ چھاؤں جیسے ہیں
میرے سب دوست ماؤں جیسے ہیں

موسمِ حبس میں مری خاطر
ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں جیسے ہیں

اِن کو آتی نہیں ریا کاری
شہر میں رہ کے گاؤں جیسے ہیں

یہ محبت کو عام کرتے ہیں
کام ان کے دعاؤں جیسے ہیں

ان کے انداز مہربانی کے
میرے رب کی عطاؤں جیسے ہیں

ہائے یہ لوگ یہ چمکتے لوگ
ان کے چہرے شعاعوں جیسے ہیں

ان سے دوری کے ایک دو لمحے
آسمانی سزاؤں جیسے ہیں

سید فرخ رضا ترمذی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

حادثوں نے کر دیا شاعر مجھے
کام یہ بھی اکتسابی ہو گیا

آخری بات

میں اسٹیشن پہ پہنچا تھا
اُسے رخصت جو کرنا تھا
کبھی ہر وقت
یوں ہی بات کرتی، مسکراتی، شوخیاں کرتی
عجب لڑکی
خدا جانے وہ کیوں خاموش تھی اتنی
وہ سپنوں سے بھری آنکھیں
بڑی بے چین تھیں اس دن
گلابی لب لرزتے تھے
اگرچہ کپکپاتے تھے
مگر خاموش رہتے تھے
مرے دل میں خیال آیا
کہ میں کہہ دوں
سنو، جاناں!
یہ اسٹیشن نہ یوں تم چھوڑ کر جاؤ
یقیں مانو کہ اب ہر پل
مجھے تم یاد آؤ گی
مگر جب کہہ نہیں پایا
تو الجھن بڑھ گئی دل کی
بہت مجبور تھا میں بھی
کہ اُس سے پوچھ ہی بیٹھا
یہ اتنی خامشی کیوں ہے؟
اگر ممکن ہو تو کہہ دو
کوئی تو بات ہے ایسی
جو تم کو مجھ سے کہنی ہے
تو وہ چونکی
مجھے دیکھا
پھر اپنی مرمریں سی انگلیاں آپس میں الجھا کر
ذرا سا سوچ کر بولی
''خدا حافظ''

وسیم جبران

رات

رات گہری بھی ہے اور خاموش بھی
تھوڑی جاگی ہوئی اور مدہوش بھی
ایسے بے خواب ہے
نیند سے کوئی جیسے تعلق نہ ہو
اور سنسان ایسی کہ میلوں تلک
کوئی جگمگ ستارہ معلق نہ ہو

رات کا ایسے دامن ہے پھیلا ہوا
دور تک چاند کا کوئی سایہ نہیں
یہ ابھاگن ہے وہ جس کی آغوش میں
پھول کھلتا نہیں، کوئی جایا نہیں

رات کے لب پہ ہے چپ کا پہرا کوئی
بھید ہے اس کے سینے میں گہرا کوئی
اور اک چیخ سا اس کا سناٹا ہے
بے پنہ درد کو اس نے بھی کاٹا ہے

رات لمبی بھی ہے اور سیہ رخت بھی
ہائے تنہا بھی ہے اور سیہ بخت بھی

اس کو سب علم ہے
کس کے بستر پہ پڑتی نہیں ہے شکن
کس کی آنکھوں میں ہے رتجگوں کی چبھن
بھید سب جانتی ہے بتاتی نہیں
شب گزیدہ دریچوں پہ رک جائے تو
پھر یہ جاتی نہیں

رات محرم بھی ہے اور انجان بھی
یہ ہے مہمان پرور بھی مہمان بھی

راز سنتی بھی ہے اور کہتی بھی ہے
آنسوؤں کی صداؤں کی سامع ہے یہ
اپنے حسنِ سخن میں بھی جامع ہے یہ
رات بربط بھی ہے رات سہ تار بھی
رات نغمہ بھی ہے اور صدا کار بھی

یہ حواسوں پہ چھاتی ہوئی اپسرا
دھوکا دے کے چلی جائے وہ دلربا
زلف پھیلائے ہے رقص کرتی ہوئی
اپنا جادو چلا جاتی ہے یہ بلا
جس طرح سرسراتا لپٹ جاتا ہے
پورے تن کو نگلتا ہوا اژدھا
رات دلکش بھی ہے اور دہشت زدہ
رات راحت بھی ہے اور وحشت زدہ

رات کٹتی نہیں پھر بھی کٹ جاتی ہے
بھاگتا دوڑتا دن گذر جاتا ہے
اپنے سائے بڑھائے یہ آجاتی ہے
اور ضدی گھنی اس کٹھن رات کو
اک روپہلی کرن آ کے کھا جاتی ہے
رات منہا بھی ہے اور مقسوم بھی
رات پرکار بھی اور معصوم بھی

شاہدہ مجید

''غلام گردش''

سُلگتی راکھ کا منظر ہے روشنی کی صبُوح
اندھیرا خوف کا پھوٹا ہے کس جہان سے یہ؟
کہ جس نے حلق سے آواز تک چُرا لی ہے
مگر یہ کون کہ معنیٰ اِسی سکوت سے لے
کوئی غلام ہی ہو گا کہ چپ سمجھتا ہے
صدا اُٹھاؤ کہ ہم سانس بھر تو جی پائیں
جو گروی رکھ دی ہے اک جس کی تجوری میں
عوض میں جس کے یہ کچھ بے وقار سانسیں لیں
صدا کے کعبے کو مسمار اَبرہَہ نے کیا
صدا بچانے ابابیل تک نہیں اُتری

صدا اُٹھاؤ کہ نکلیں غلام گردش سے
کہ جس میں دفن کئی نسل کی صدائیں ہیں
یہ میری سوچ میں رقصاں مرے سوال ہیں جو
سرِ خمیدہ کو بخشیں گے تاب اُٹھنے کی
یہی وہ آگ جو اس جبر کے اندھیروں کو
نوالہ جان کے نگلے گی ایک ساعت میں
سُلگتی سوچ یہ کہتی ہے میرے کانوں میں
''سلگتی راکھ بھی رکھتی ہے ایک خُوئے نمو
سُلگتی راکھ کا منظر ہے روشنی کی صبُوح

ظفر اقبال نادر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

الزام لگائیں گے ، یاروں پہ وہ کیا خالد
یاروں کے سوا خالد ، دشمن ہمیں کیا دیں گے

ایک لڑکی [نثری نظم]

بین الاقوامی تعلقات میں گریجویشن
کرتی ہوئی لڑکی
یہ تو جانتی ہوگی
کہ اکثر دوستیاں دائمی نہیں ہوتیں
یہ بنتی ہیں، بگڑتی ہیں
بس مفادات کی خاطر
یہ دوستی تب تک ہی رہتی ہے
جب تک کسی کو حاجت رہتی ہے کسی کی
ورنہ کچھ نہیں
دوستی کے یہ بندھن
پل میں ٹوٹ جاتے ہیں
دوست بن جاتے ہیں دشمن
اور دشمن دوست بنتے ہیں

یہ لڑکی
یہ بھی جانتی ہوگی
کہ چھوٹوں کی تو کوئی مرضی نہیں ہوتی
انھیں تو چاہنا ہے بس وہ ہی
جو چاہتے ہیں بڑے اُن کے
انھیں تو کرنا ہے بس وہ ہی
جو کہتے ہیں بڑے ان کے
انھیں تو اپنی مرضی سے خواب بھی نہیں دیکھنا کوئی

مگر یہ لڑکی
سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے پھر بھی
اپنے سارے سبق بھلا بیٹھی
اک لڑکے سے دل لگا بیٹھی
اس کے ساتھ گھر بسانے کے
خواب آنکھوں میں سجا بیٹھی
وہ یہ بھول بیٹھی تھی
کہ ایسی دوستیاں دائمی نہیں ہوتیں

اس کے بڑوں نے پھر اس کو
یاد کروائے، وہ سبق سارے
جنھیں وہ بھول بیٹھی تھی
بڑوں نے اپنی چھوٹی پر
پابندیاں لگا دی ہیں
اب وہ سر پٹختی ہے
اسے اب آگے نہیں پڑھنا
اسے اب وہ ہی کرنا ہے
جو کہتے ہیں بڑے اُس کے
اُسے چپ چاپ اب تو بیٹھ جانا ہے
اپنے اک کزن کی ڈولی میں
اسے اب سارے خواب بھول جانے ہیں
اُسے پھر یاد کرنے ہیں
وہ سبق سارے
جو وہ بھول بیٹھی تھی

سید ضیا حسین

نظم

زعیم رشید

کالج میں آتے ہی یوں لگ رہا ہے کہ جیسے
مرے جسم پہ کوئی پر لگ گئے ہیں
میں بالی عمریا میں سب عشقیہ داستانوں کو پڑھنے لگا ہوں
موبائل کے میسج میں کیوں دوستوں سے چھپانے لگا ہوں
گزرتی ہوئی خوبرو لڑکیوں کو میں چھپ چھپ
کے کیوں دیکھنا چاہتا ہوں
جوانی کی سیڑھی پہ چڑھنے سے پہلے ہی نیندیں
سرکتی چلی جا رہی ہیں
اٹھارہ سے پہلے میں کمرے میں چھپ کر وہ
سب دیکھتا ہوں جو ہیجان ہے----
جس کا نقصان ہے
ادھر باپ پند و نصیحت کی گٹھری کو کھولے کھڑا ہے
ادھر ماں زلیخا کا قصہ سنا کر مجھے سورۂ یوسف
کا دم کر رہی ہے
جوانی کوئی دھند ہے جس میں اترے چلا جا رہا ہوں
کوئی دھوپ میرے بدن کو جلائے.....تو کیا لطف آئے
محبت مرا ہاتھ تھامے ہوئے ہے
مجھے زندگی گنگنانے لگی ہے
مرے خواب رنگین ہونے لگے ہیں

مجھے کھا گئی

تری بے رخی مجھے کھا گئی
مری بے بسی مجھے کھا گئی

کبھی روشنی مجھے کھا گئی
کبھی تیرگی مجھے کھا گئی

کبھی سرخوشی مجھے کھا گئی
کبھی بے کلی مجھے کھا گئی

میں اسیرِ زلفِ سخن رہا
خوئے میکشی مجھے کھا گئی

وہ مرا تھا ، میرا نہ ہو سکا
یہی تشنگی مجھے کھا گئی

میں رقیب کو نہ سمجھ سکا
مری سادگی مجھے کھا گئی

میں قتیلِ حسنِ قمر ہوا
تری چاندنی مجھے کھا گئی

کبھی جوشِ عشق نے پی لیا
کبھی عاشقی مجھے کھا گئی

مرا باغِ عشق اجڑ گیا
ہوا سر پھری مجھے کھا گئی

ترے چہرے کی، مرے زخم کی
تھی جو تازگی مجھے کھا گئی

مری سطر سطر لہو ہوئی
یہ سخنوری مجھے کھا گئی

نہ نکل سکا میں خیال سے
مری شاعری مجھے کھا گئی

میں خود اپنا دشمنِ جاں ہوا
تری دوستی مجھے کھا گئی

صفِ دوستاں میں جو تھی چھپی
وہی دشمنی مجھے کھا گئی

تری جستجو نے کیا ہڑپ
مجھے آرزو تری کھا گئی

مری شب رہینِ الم نہ ہو
یہی فکر ہی مجھے کھا گئی

یونہی تارے گنتے گزر گئی
شبِ سرمئی مجھے کھا گئی

دو جہاں لٹا دیے عشق پر
یہ سکندری مجھے کھا گئی

مری موت کھا نہ سکی مجھے
مری زندگی مجھے کھا گئی

مظہر اپنا بھید نہ کھل سکا
مری آگہی مجھے کھا گئی

مظہر حسین مظہر

نثری نظم

گئے وقتوں میں ہم دوست ہوا کرتے تھے
ایک دوسرے کے سنگ وقت بتانے کے
بہانے ڈھونڈتے رہتے
پہروں بیٹھ کر
نہ ہنسنے والی باتوں پر بھی ہنستے رہنا
کتنا اچھا لگتا تھا
پھر جانے کب سب وقت کے سیل رواں
میں بہہ گیا
جانے کہاں کھو گئے فرصت کے وہ روز و شب
اور اب تو یہ عالم ہے کہ تمہارے فون کا نمبر
بھی ذہن کی سلیٹ سے ڈیلیٹ ہو چکا ہے
اگر کبھی سر راہ مل بھی جاؤ تو دل کو خوشی
کے ساتھ ایک نامعلوم سی اجنبیت گھیر
لیتی ہے
جو فاصلہ اب ہمارے درمیاں حائل ہے
اسکی وجہ نہ تمہارے علم میں ہے اور نہ میرے
بس دونوں اپنی اپنی انا میں مقید
خود سے نبرد آزما ہیں
"صحنِ دل سے ملال رت رخصت ہو
جائے تو سمجھو عشق تکمیل پا گیا
کیونکہ اب دل وہاں دھڑکتا ہے جہاں
محبت فاصلوں سے ماورا ہے"

ماسک [نثری نظم]

مجھے بچپن میں جگنو پکڑنا بہت اچھا لگتا تھا
سرِ شام گھر سے نکل جاتی
جلتی بجھتی قمقموں جیسی روشنیوں والے
ٹمٹماتے جگنو مٹھی میں چھپا لیتی
جلتی بجھتی روشنیاں ہتھیلیوں کو چھوتیں
تو آنکھیں بھی ستاروں سے بھر جاتیں
مگر اب جگنو کہیں کھو گئے ہیں
زمیں کی کثافت سے ستارے بھی دھندلا گئے ہیں
جذبے خلوص سے عاری ہیں
شہر کے لوگ ماسک پہن کر باہر نکلتے ہیں
فضا میں وقت نے کتنی کثافتیں بھر دی ہیں
اس لیے احتیاط بہتر ہے
اس سے پہلے کے آپ خود کو اور روح کو
چھید چھید کر دینے والے جرثوموں کے
حوالے کر دیں
ماسک روح کو آلودگی سے بچانے اور
زندگی کو رواں رکھنے کا آخری ہتھیار ہے

نائیلہ راٹھور

''مگر پھر لوٹ جاتے ہیں'' [نثری نظم]

کتنے انمول ہیں وہ آنسو
جو آنکھوں سے نہیں بہتے
دکھائی جو نہیں دیتے
وہ آنسو
جھیل کی سی گہری آنکھوں سے
باہر نکلنے کو جب بہت بے چین ہوتے ہیں
تو کوئی احساس ماضی کا
انھیں آنکھوں کی سرحد پر
یہ کہہ کر روک لیتا ہے
ابھی تم نے نہیں بہنا
وہ کہہ گیا تھا
پہاڑوں پر برف پگھلنے تک
میرا انتظار کر لینا
بہت ہی خوبصورت ہیں
وہ آنسو
جو پانی کے کٹوروں کی
طرح سے جھلملاتے ہیں
وہ آنکھوں تک تو آتے ہیں
مگر پھر لوٹ جاتے ہیں

خالق آرزو

خطوط

آصف ثاقب

شعروادب کی جدتوں کے البیلے عمران منظور صاحب

السلام علیکم!

انتظار آخر انتظار ہے دیر ہو جائے، تو آنکھوں میں اندھ آجاتی ہے۔ ''بیاض'' پہنچا تو دل کو قرار آیا آنکھوں پر پلکوں کا بوجھ نہیں ہوتا۔ جی شاد ہوا آنکھیں آباد۔

ہر ورق پر حسن و خوبی کا سہاگ برس رہا ہے

کوئی سکوں کا طلب گار ہو تو ایسا ہو

باخاطر حسنِ طلب ہر تحریر پڑھی۔ ''بیاض'' کے بیک ٹائٹل پر اطلاع حیرت انگیز ہے یہ آپ ہی جانیں۔ ہر تحریر کی اپنی کیفیت ہوتی ہے اپنا لطف ہوتا ہے۔ یکسانی سے دل اوبھ جاتا ہے۔ خطوط کا شعبہ ہمہ رنگ ہے اور مقبول۔ جمیل یوسف صاحب کی نظر کرم سے مستفید ہوا۔ انھوں نے سخن فہمی کے باب میں اچھی رائے دی ہے۔ نسیم سحر صاحب اور آفتاب احمد ملک صاحب کی مہربانیاں شاملِ حال ہیں۔ ممتاز راشد صاحب (لاہوری) نے بھی توجہ کی ہے۔ احباب کی حوصلہ افزائی ہی سے دل کو تسلی ہوتی ہے۔ میری غزل کے مطلع کا پہلا مصرع کچھ عجیب ہو گیا ہے۔ کمپوزنگ کا کیا دوش! کچھ اپنی ہی غلطی ہوگی۔ ہر نوع مصرع ہے:

مثال ایسی یہیں نہیں ہے

انک کے تصور اقبال صاحب کو ''شریک بیاض'' دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ''بیاض'' نے عقیدت نگاری کو سینے سے لگایا ہے۔ اس مناسبت سے رسالے کا وقار بڑھ گیا ہے۔ حمد، نعت، سلام کے 'مطالعاتی اختصاص'' میں وسعت آئی ہے۔ خدا آپ کو اور لکھنے والوں کو توفیق دے۔

خیر اندیش

جمیل یوسف

برادر عزیز جناب عمران منظور صاحب۔ سلامت رہیں۔

السلام علیکم ورحمتہ اللہ!

اکتوبر کا ''بیاض'' خزاں کی آمد آمد کا آنچل اوڑھ کر جلوہ افروز ہوا۔ خزاں کا بھی اپنا ایک حُسن ہے۔ میرا ایک شعر ہے:

میں جانتا ہوں خزاں فصل گُل کا وقفہ ہے

مجھے بہار کی ہر بات راس آتی ہے

اس دفعہ کیا حمد اور کیا نعت اور کیا غزل۔ ہر جگہ جناب نسیم سحر چھائے ہوئے ہیں۔ اس طرح کے اشعار اور کس نے کہے ہیں۔ خیال رہے، صرف بات نہیں کہنی۔ شعر کہنا ہے:

نظر مری پس افلاک ہو تو حمد کہوں
کچھ اس کی ذات کا ادراک تو حمد کہوں
گداز دل میں ذرا اور پیدا ہو جائے
یہ آنکھ اور بھی نمناک ہو تو حمد کہوں
پرانے لگتے ہیں لفظوں کے پیرہن مجھ کو
عطا کوئی نئی پوشاک ہو تو حمد کہوں
جو اُس مدینۂ جنّت نشاں کو دیکھ لیا
تو گویا حاصلِ کون و مکاں کو دیکھ لیا

اب اور کیا مجھے کچھ دیکھنے کی خواہش ہو؟
دیارِ نور کو، شہرِ اماں کو دیکھ لیا
کچھ اور بڑھ گیا احساسِ تشنگی داماں
جو آپؐ کے کرم بے کراں کو دیکھ لیا

کہا تھا کس نے کہ یوں آسماں اُٹھائے پھرو
سو اب یہ بارِ گراں میری جاں اُٹھائے پھرو
زمین پاؤں تلے سے سرکتی جاتی ہے
جدھر بھی جاؤ تُم اپنا مکاں اُٹھائے پھرو

ہوئے ہو تم جو شکستہِ خواب کے ساتھ کم اعتباری دُنیا کا یہ تقاضا ہے
اب اپنی ٹوٹی ہوئی کرچیاں اٹھائے پھرو یقین دفن کرو اور گماں اُٹھائے پھرو

اب جس خوبصورت اور باکمال غزل کی میں جی بھر کے داد دینا چاہتا ہوں، وہ غزل ہے محترمہ عنبرین خان کی۔ محترمہ عنبرین خان "بیاض" کے مجلہ غزل میں پہلی دفعہ تشریف لائیں ہیں۔ اور اشعار کا ایک خوبصورت گل دستہ لے کر آئی ہیں۔ اُن کی غزل کا ہر شعر اس قابل ہے کہ قند مکرر کے طور پر نذر قارئین کیا جائے۔ کیا خوب مطلع کہا ہے:

بچھڑنے پہ رضامند نہیں ہوتے ہیں ساتھ چلنے کے بھی پابند نہیں ہوتے ہیں

میرا خیال ہے یہ بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ شاعرہ نے یہ شعر کس کے بارے میں کہا ہے البتہ میں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ جس زنجیر تعلق کو بڑی خوبصورتی سے اس شعر میں اُجاگر کیا گیا ہے اس کا اظہار آج تک کسی شاعر نے یوں تغزل سے بھرپور انداز میں نہیں کیا۔ شاعرہ کی بات کا جواب چچا غالب پہلے ہی دے چکے ہیں:

غرض دو گونہ عذاب است جانِ مجنوں را بلائے صحبتِ لیلیٰ و فرقتِ لیلیٰ

اتفاق دیکھیں:

یہاں مجھے اپنا ایک شعر بھی یاد آیا ہے:

قید سے اُس کی رہا ہو کے کہاں جاؤں گا توڑ کر پھر سے بناتا ہوں زنجیر کو میں

عنبرین خان کا اگلا شعر ہے:

ہم سمجھ لیتے ہیں تقدیر کا اک کھیل اسے جانے والے سے گلہ مند نہیں ہوتے ہیں

اور یہ کتنا اچھا شعر ہے:

ساتھ دنیا کے کسی صورت مجبوری میں ہم کھڑے ہوتے ہیں، ہر چند نہیں ہوتے ہیں

کوئی کم تر درجے کا شاعر ہوتا تو صورت مجبوری کی جگہ حالت مجبوری کہہ دیتا:

ذرا مضموں کوئی یوں باندھ لے اے شاد مشکل ہے سلیقہ انتہا کا چاہیے موتی پرونے میں

محترمہ عنبرین خان کا اگلا شعر سنیں اور سر دُھنیں:

ان سے آداب و رسومات سمجھنے والو یہ جنوں پیشہ، خرد مند نہیں ہوتے ہیں

یہ جنوں پیشہ یعنی یہ عاشق مزاج اور شاعر لوگ۔ اور یہ آخری شعر تو صرف ایک ماں ہی کہہ سکتی ہے مگر کسی شاعرہ نے آج تک اس طرح کہا نہیں۔ اس صورت حال کے بیان میں الہام کا لفظ استعمال نہیں کیا:

دل پہ ماؤں کے بھی ہو جاتا ہے الہام اکثر جب بھی آرام میں فرزند نہیں ہوتے ہیں

ساری غزل میں الفاظ کا چناؤ، ان کا در و بست اور نشست بڑی پختگی اور مشاقی کا پتہ دیتی ہے۔ ماشاءاللہ

نسیم سحر

برادرم عمران منظور، سلام مسنون۔

ربیع الاوّل کے ماہ مبارک کا آغاز ہو چکا ہے، میری طرف سے بیاض سے منسلک تمام اراکین ادارہ اور قارئین کو مبارکباد۔

اس مرتبہ بیاض کا شمارہ خلاف معمول چار دن کی تاخیر سے ملا۔ سرورق کی پشت پر آپ کا یہ اعلان بھی نظر سے گزرا کہ بیاض میں اب ادبی رپورٹ، سفرنامہ، فلیپ، دیباچہ، یادیں، انشائیہ اور آپ بیتی شائع نہیں ہوگی بلکہ صرف شاعری، افسانہ، طنز و مزاح، تنقید اور ادبی نوعیت کے خطوط ہی شائع کیے جائیں گے۔ لیکن میرے خیال میں آپ بیتیوں اور سفرناموں پر تو پابندی نہیں لگنی چاہیے کہ یہ تو باقاعدہ ادبی اصناف میں شمار ہوتی ہیں اور بیاض کے اکثر شماروں میں ان اصناف کی تحریریں بڑی دلچسپ بھی ہوتی تھیں۔ بہرحال جو مزاج یار میں آئے۔ ویسے بھی میں براہ راست اس پابندی سے متاثر اس لیے نہیں ہوا کہ تا حال میں نے آپ بیتی یا سفرنامہ لکھا ہی نہیں۔

اکتوبر کے شمارے میں حمد و نعت کے درج ذیل اشعار نے دامنِ دل کو کھینچ لیا:

حمد

یہ شرق و غرب، شمال و جنوب، ارض و سما
فقط اسی نے کیا شش جہات کو پیدا
سید ریاض حسین زیدی

مخلوق کی تخلیق ہے اک 'کُن' کا اشارہ
ہے سارے جہانوں پہ فقط اس کا اجارہ
محمد انیس انصاری

یہ کس کے قبضۂ قدرت میں ہے نظامِ کائنات
سحاب کس کا، زمیں کس کی، داب کس کی ہے
افشاں احمد انور

ملا کر سجدۂ ارضِ حرم سے
فضائے ارضِ پاکستان رکھنا
سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

عطا جو ہوتے ہیں اس در سے گاہ گاہ ہمیں
عجب ہیں مذتیں اُن نور کے نوالوں کی
ڈاکٹر ریاض مجید

ممکن ہی نہیں آپؐ سا آفاق میں کوئی
اے ذوقِ نظر، دیکھ عرب میں نہ عجم میں
محمد یٰسین قمر

خراب حال ہیں اقوام بالعموم، مگر
خراب تر تری اُمت کا حال ہے آقا
خاور اعجاز

کتاب خالق و مخلوق کا وثیقہ ہے
صحیفے لوح پہ تائید ہیں مزید کے
علی اصغر عباس

لوگ کہہ دیتے ہیں خوشبو، اور ہم
تیرے کوچے کی ہوا کہتے ہیں
اکرم ناصر

توحید کے خلاف کھلی جب کوئی زباں
لب پہ تھا سنگ ریزوں کے کلمہ رسولؐ کا
اکرام الحق سرشار

زباں سے کہنا ضروری نہیں عدیم یہاں
ہر ایک اشک مرے کیف کا جریدہ ہے
عباس عدیم قریشی

غزلوں میں کافی اچھے اشعار بھی ہیں اور اسی طرح کچھ نظمیں بھی بڑی جاندار ہیں لیکن یہ خط پہلے ہی تاخیر کا شکار ہو چکا ہے اس لیے اب وہ اشعار یا نظموں کے اقتباسات لکھنے سے گریز کر رہا ہوں۔ خاور اعجاز کے ترجمہ شدہ ہائیکو اور انجم جاوید کے طنز و مزاح والے ہائیکو بھی خوب تھے۔

افسانوں میں جناب حبیب الرحمٰن کا 'ادھوری کہانیوں کا نوحہ' سید تحسین گیلانی کا 'کہانی ایک خواب کی' نور کمال شاہ کا 'بھوک کے مارے لوگ' حسنِ تحریر کے شکارے دے رہے ہیں فرخندہ شمیم نے بھی 'قرنطینہ' کے عنوان سے شاندار افسانہ لکھ کر چونکا دیا ہے کہ یہ افسانہ ان کے پچھلے افسانوں کے مقابلے میں بالکل منفرد اور مختلف لگا۔ جناب شوکت علی شاہ کی بہت ہی دلچسپ آپ بیتی حسبِ معمول پوری توجہ سے پڑھی اور اس قسط کے آخر میں "جاری ہے" پڑھ کر دعا کی کہ کم از کم یہ آپ بیتی جاری رہے اور اس پر آپ کی نئی پابندی کا اطلاق نہ ہو۔ شکر ہے کہ درخشندہ نوید کے حج کے سفرنامے کی یہ آخری قسط تھی۔

جناب جمیل یوسف کا مضمون "سخن گوئی اور سخن شناسی" اچھا تھا اور ان کے وسیع مطالعہ کے ساتھ ساتھ ان کی صاف گوئی کا مظہر بھی۔ جناب محمد ارشاد نے بیاض لاہور کے لاہور نمبر کی اولیت کی مبارک دینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی خوب کہا کہ یہ نمبر اس لیے لاہور کے شایانِ شان نہ تھا کہ ادارے کو جولی پایا چھاپ دیا۔ پھر انہوں نے لاہور کے بارے میں اہم تاریخی اور جغرافیائی معلومات سے نوازتے ہوئے اور بھی کتنے جہانوں کی سیر کرا دی جس پر ان کا شکریہ۔ پروفیسر جلیل عالی نے ڈاکٹر رشید امجد کی یاد میں "یاد یارِ دیرینہ" کے عنوان سے خوبصورت یادنگاری کی ہے اور مجھے بھی اُن دنوں کی یاد دلا دی ہے جب میں کئی بار ڈاکٹر رشید امجد کے اس گھر میں جو ایک مندر کے اندر تھا، نثار ناسک، سید احمد اور امانت ندیم کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ یہ مندر راجہ بازار چوک کے آخر میں کشمیری بازار میں امانت ندیم کے بکسٹال سے تھوڑی سی دوری پر تھا۔

جناب آصف ثاقب کا شکریہ کہ انہوں نے اپنے خط میں میری رہنمائی کی اور بتایا کہ "پاکستانی ادب کے معمار" کتاب اکادمی ادبیات پاکستان سے حاصل کی جا سکتی ہے، ان شاء اللہ میں اپنی پہلی فرصت میں یہ کتاب جو جناب آصف ثاقب کے فن و شخصیت کے بارے میں ہے، حاصل کروں گا، اور میں بذاتِ خود اکادمی کے بکسٹال سے یہ کتاب خریدوں گا کہ تحفتاً کتاب

حاصل کرنا ضروری نہیں، اصل بات بس کتاب کا حصول ہے۔ جناب رانا محمد شاہد نے مشاعروں کے اختتام کے بعد منتظمین مدعو شعراء سے جو سلوک کرتے ہیں اس کی بالکل درست ترجمانی کی ہے۔خود مجھے بھی ایسے کئی تجربات ہو چکے ہیں کہ ادھر مشاعرہ ختم ہوا، ادھر منتظمین نے باقی تمام ذمہ داریوں سے ہاتھ دھو لیے۔

خیر اندیش:

آفتاب احمد ملک

برادر محترم عمران منظور صاحب! آداب!

ماہنامہ بیاض، اکتوبر کا ''خزاں شناسوں'' کے فرنٹ ٹائٹل اور ''اطلاع'' کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ اندرونی صفحات پڑھ کر خزاں رسیدہ لمحوں کو بھول کر رنگین تحریروں میں اُلجھ گیا۔ شگفتہ پھولوں کو سونگھ کر اداس لمحوں کو بھول گیا ہوں۔ شوکت محمود شوکت کے اس شعر نے سارا ذہنی خاکہ بدل ڈالا کہ:

شام ہوتے ہی تیری یاد کے جگنو اکثر
قریۂ دل میں اندھیرا نہیں ہونے دیتے

شہرِ جاناں میں گزارے ہوئے لمحے شوکت
شہرِ دیگر میں بسیرا نہیں ہونے دیتے

241 صفحات میں ادب کی اصناف میں قدیم و جدید روایات اور تاریخی و تحقیقی سرگرمیوں پر تفصیلات شائع ہوئی ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں برادرم محمد ارشاد نے لاہور کی قدیمی تاریخ کے مستند حوالہ جات سے تفصیلی و تحقیقی مضمون تحریر کیا ہے (صفحہ نمبر 189-181) خالص ادبی موضوع قدیم و جدید شعراء کے شاعرانہ کمالات پر گہری نگاہوں سے برادرم محسن یوسف صاحب نے بعنوان ''سخن گوئی اور سخن شناسی'' لکھ کر ورطۂ حیرت میں ڈال دیا بلکہ ماہر غالبیات کے لیے تحریری چیلنج ہے۔ (صفحہ نمبر 180-177)

دینی شاعری حمد و نعت میں بصیرت آموز لفاظی باعث طمانیت ہے۔ سلیمان عبداللہ ڈار صاحب کا عارفانہ مضمون (تصوف) بھی خوب ہے۔ ''پریتم ایسی پریت نہ کریو'' (صفحہ نمبر 32-29) پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ''شاہ و داستان'' میں ڈپٹی کمشنر کے ماضی میں جو اختیارات رہے آج کے حالات کے تقاضوں کے مطابق موازنہ کیا ہے۔ شوکت علی شاہ قلم کے دھنی ہیں۔ دوران سروس مشاہدات و تجربات کو صفحۂ قرطاس پر شاعرانہ و ادیبانہ انداز میں منتقل کرنے کو بخوبی ہنر جانتے ہیں۔ معلوماتی و دلچسپ زندگی کا منظرنامہ بھی ہے۔ رخشندہ نوید صاحب نے سفرنامہ حج کی آخری قسط قارئین کی نذر کی ہے۔ ماں کی چادر دعاؤں سمیت بخیریت لاہور واپس پہنچ گئی۔ (صفحہ نمبر 95-90) افسانوں میں خواتین و حضرات کے اپنے اپنے خیالات اور موجودہ کلف نما سم تھور زدہ معاشرتی کہانیوں کو خاص رنگ میں تحریر کیا ہے۔ نئی مطبوعہ کتابوں پر تبصرہ جات، شخصی خاکہ معلوماتی خزانہ ہیں۔ تبصرہ پڑھ کر مصنف یا شاعر کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑتا ہے جبکہ اندرونی دونوں صفحات پر آٹھ نئی کتاب کے رنگین ٹائٹلز دیکھ کر اشاعتی خوشی ہوتی ہے۔

کافی تحریروں کے پیشِ نظر آپ کی انتظامیہ نے بعض مضامین کی اشاعت سے قبل ہی معذرت کر لی ہے۔ نظم، ماہیے، ہائیکو، گیت اور رباعیات میں بھی شعراء دوستوں نے اپنے تخیلات کی روشنی میں اشعار لکھے۔ مختصر بحروں میں طویل موضوعات کو سمیٹنا ہر کسی لکھاری کا کام نہیں ہے۔

احباب کی غزلیات کے چند اشعار جو حافظے میں محفوظ ہوئے ہیں:

صحراؤں کے بیٹے
شہروں میں بنجارے
کون کسی کو پکار
شہر انا میں خالد

خالد احمد

خوشیاں ہیں محیط اس میں
مکاں کے اندر کہیں نہیں ہے
دماغ خوشبو سے بھر ہی جائے
خیال ہی عطر بیز نہیں ہے

آصف ثاقب

گزر گئے ہیں کئی بار خود سے بھی آگے
ہم اپنے حرف ہنر مستند بناتے ہوئے
جلیل عالی

یہ میرے عشق کی شریعت ہے
آپ کو دیکھنا عبادت ہے
یہ جو میں ایسے شعر کہتا ہوں
یہ مرے عشق کی بدولت ہے
جمیل یوسف

دل میں جب خواہش دیدار کے شُعلے بھڑکے
کھا گیا وقت کا بے رحم سمندر چہرے
سید قاسم جلال

شعر اور غزلیں بھی ساتھ ساتھ ہیں میرے
میں تو کل بھی تھا اقبال اپنی ذات کے اندر
اقبال سروبہ

وقت میلہ گھوم آیا ہے اگرچہ ہر کوئی
پھر بھی کہنا ہے غلط کوئی سفرباقی نہیں
اسلام عظمی

شعر خوں بن کے رگ و جاں میں اتر جاتے ہیں
درد لفظوں کا سر لوح و قلم بولتا ہے
شفیق احمد خان

ہو گئی حسن سماعت کی روایت رخصت
اب تو غزلیں بھی سُنی جاتی ہیں جھنکار کے ساتھ
بدر منیر

جس جس کا زبر، زیر بھی یا پیش غلط ہے
اُس اُس کا تلفظ بھی کم و پیش غلط ہے
کیسا موسم ہے شہر پر طاری
دوست پیارے بچھڑتے جاتے ہیں
سید فرخ رضا

کس قدر خوش ہیں پرندے بھی فضائیں بھی نہال
بعد مدت کے یہاں ٹھنڈی ہوا اتری ہے
عقیل رحمانی

حاکم وقت کے پڑھتے ہیں قصیدے جو لوگ
ان کے ملبوس میں پیوند نہیں ہوتے ہیں
عنبرین خان

آواز مری گونجی اُس شہر کی گلیوں میں
لوگوں نے بُھلا ڈالا ، جب زیر زمیں سمجھا
ظہور چوہان

کچھ ایسے لوگ بھی اک عمر ساتھ رہتے ہیں
ستارے مل گئے قسمت سے دل ملا ہی نہیں
رخشندہ نوید

دنیا سے ہے پیار تجھے
یہ دنیا تو فانی ہے
رُک جانا اقبال میاں
تازہ نظم سنانی ہے
تصور اقبال

خطوط نگار بھائیوں کے علمی و ادبی تبصرہ جات، دل کی باتیں، تجاویز آرا پڑھ کر ماہ گزشتہ کے مجموعہ کلام ''بیاض'' کی تحریری روداد تازہ ہو گئی۔ اور محبت بھری معنی خیز غزل کے دو اشعار قابل داد ہیں:

لبوں پہ چپ کے گلاب رکھنا
یہ چہرہ روشن کتاب رکھنا
محبتوں کا صلہ محبت
یہ مختصر سا حساب رکھنا
بشیر احمد حبیب

طالب انصاری

مکرمی عمران منظور صاحب - بہت احترام اور مسنون سلام
بیاض کا شمارہ بابت اکتوبر 2021 نظر نواز ہوا۔ دل جذبات ممنونیت سے بھرا ہے۔ بیاض کی یہ اشاعتی اور مراسلاتی خوبی ہے کہ یہ وقت پر شائع ہوتا ہے اور اسی لیے وقت پر قارئین کو موصول بھی ہو جاتا ہے۔ بیاض کی مجلسِ ادارت کی تحسین واجب ہے۔
جمیل یوسف صاحب صاحب کا مکتوب دل چسپ ہوا کرتا ہے۔ اس مرتبہ انہوں نے اپنے مکتوب میں سحر انصاری اور قتیل شفائی کے ایک ایک شعر میں اسقام کی نشان دہی فرمائی۔ سحر انصاری کے شعر میں تو میں ان سے اتفاق کرتا ہوں۔ تاہم قتیل شفائی کا شعر میری دانست میں سقم سے پاک شعر ہے۔ قتیل شفائی کا شعر ہے:

اف وہ مرمر سے تراشا ہوا شفاف بدن دیکھنے والے اسے تاج محل کہتے ہیں

جمیل یوسف صاحب کا اعتراض یہ ہے کہ قتیل شفائی کی محبوبہ کیا کوئی مزار ہے، جسے تاج محل سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ پہلے مصرع میں مرمر کے الفاظ نے تاج محل کا جواز پیدا کیا ہے۔ طلازمہ کاری پوری ہے۔ تاج محل سنگِ مرمر کا بنا ایک شاہ کار ہے اور محبت کی علامت بھی ہے۔ دیکھنے والے اسے دیکھ کر اس کے حسن اور تخلیقی صناعی سے مسحور ہو جاتے ہیں۔ اگر جمیل یوسف صاحب کے اعتراض کو صحیح مان لیا جائے تو ہم لمبے تڑنگے شخص کو استعاراتی طور پر کھمبا کیوں کہہ دیتے ہیں۔ کھمبا بھی تو ایک بے جان چیز ہے۔ یا محبوبہ کو چاند سے کیوں تشبیہ دیتے ہیں۔ ایک سائنسی فکر رکھنے والا شخص یہ اعتراض اٹھائے گا کہ کیا آپ کی محبوبہ بے آب و گیاہ لق و دق پتھریلی زمین ہے۔ یہاں ہم چاند کے طبعی ماحول کو نہیں دیکھیں گے، بل کہ اس کے چمکتے ہوئے حسن کو سامنے رکھیں گے، جو ہمیں زمین سے نظر آتا ہے۔ اسی طرح مذکورہ بالا شعر میں شاعر نے تاج محل کو بطور مزار پیش نہیں کیا، بل کہ محبت کی علامت اور حسن کے شاہ کار کے طور پر پیش کیا ہے۔ جمیل یوسف صاحب اشعار کا بہت گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں۔ شعر فہمی کا بہت عمدہ ذوق رکھتے ہیں۔ تاہم شعر فہمی میں بھی مختلف اذہان کا انداز مختلف ہوا کرتا ہے۔

غزلوں میں بیشتر بہت اچھی تھیں۔ جمیل یوسف صاحب روایت کی پابندی کرتے ہوئے بہترین اشعار کہنے پر قادر ہیں۔ زیرِ نظر پرچہ میں بھی ان کی غزل روایت کے رس میں ڈوبی ہوئی تھی اور خوب تھی۔ عنبرین خان کی غزل نے بھی متاثر کیا۔ پسندیدہ اشعار لکھنے لگوں تو خط طویل ہو جائے گا۔ صفدر صدیق رضی صاحب کی غزل کا ایک شعر یوں درج ہوا:

صد شکر اس نے گھر مرا آباد کر دیا بر بادیاں سمیٹ کے سارے جہان کی

رضی صاحب کا یہ شعر پڑھ کر مجھے ایک معروف شعر یاد آیا:

بے چینیاں سمیٹ کے سارے جہان کی جب کچھ نہ بن پڑا تو مرا دل بنا دیا

رضی صاحب کو شعر کا دوسرا مصرع داوین میں لکھنا چاہیے تھا۔

دیگر مندرجات رسالہ بھی لائقِ التفات تھے۔ سب پر تبصرہ خط کی طوالت کا سبب ہوگا۔ اور مکتوبات کے گوشے پر دیگر احباب کا بھی تو حق ہے۔

ایک غزل 'بیاض' کے لیے ملحوف ہے۔ احبابِ بیاض کی خدمت میں سلام

اشرف کمال

محترم عمران منظور نعمان منظور صاحب

السلام علیکم

نمبر کا شمارہ ملا، مطالعہ جاری ہے۔ مجموعی طور پر حسبِ سابق غزل و نظم اور نثری تحریروں پر مشتمل ہے۔

شروع میں حمدیہ اور نعتیہ کلام کے گلدستے خوشبو بکھیرتے ہیں۔ بقول ذکی طارق:

آج مضطرب ہے بہت ہی کریں آ ذکرِ صلِ علیٰ چل

بقول سرور حسین نقشبندی:

ذہن جب نعت کے انوار میں کھو جاتا ہے اک اجالا مرے اطراف میں ہو جاتا ہے

پہلے صفحے پر خالد احمد کی غزل کا مطلع ایک یاد کی کیفیت سے بھول جانے کے کرب کی سمت اشارہ کرتا ہے:

لیے پھرتا تھا جو در در مجھ کو بھول سکتا ہے وہ کیونکر مجھ کو

آغا گل کا افسانہ 'سیدڑ سنگھی' فضل کے کردار کو سامنے رکھ کر دلچسپ پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ ایک مخصوص دور سے اور لوگوں سے وابستہ چھوٹی چھوٹی خواہشوں کے لیے جادو نگری سجائے ہوئے لوگ۔ کچھ سطور دیکھئے

گیدڑ سنگھی مل جائے تو سارے دلدر دور ہو جائیں۔

سمجھو کہ لاٹری نکل آئی ہے۔

کیا جادو ہے۔ دیکھے بغیر ہی رشتہ طے ہو گیا۔

ہاتھ کی لکیروں اور ستاروں کی چال سے قسمت ہی بتادیں۔
اس کا مربی زائچہ پیدائش بنوانا چاہتا تھا۔
آپ سے تو فال نکالنے والا طوطا ہی بہتر ہے۔
فرحت پروین کا افسانہ ''آخری تنکا'' بدلتی ہوئی صورت حال بیانیہ ہے۔ نخی تحمول کا غازی سرفروشی اور شہادت کی داستان بیان کرتا ہے۔
سعدیہ بشیر کی غزل کا مطلع خوب ہے۔ خالی ہاتھ، دلاسے اور کاسے:

ہاتھ خالی تھے سو ہم کو کاسے ملے　　　بعد مرنے کے کتنے دلاسے ملے

شہر گاؤں بستیوں کی رونق پیاروں سے ہوتی ہے۔ ندیم عباس اشرف کی غزل کا شعر خوب ہے

تیرے بعد آیا میں اک بار ترے گاؤں میں　　　راستہ اب کہ ترے گاؤں کا ویران بھی تھا

ستمبر کا شمارہ خوبصورت تحریروں سے مزین ہے۔ تمام تحریریں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں، اپنے اپنے موضوع کی مناسبت سے خوب ہیں۔

رانا محمد شاہد

محترم عمران منظور، اعجاز رضوی صاحب
السلام علیکم!
ادبی جریدہ ادب اور ادیب کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کرتا ہے اور ''بیاض'' یہ کردار بخوبی نباہ رہا ہے۔ باقاعدگی سے ہر ماہ کی یکم تاریخ کو ملنا اس جریدے کی اضافی خوبی ہے۔ ''بیاض'' کے سرورق اور پس ورق کی بیک سائڈ پر موجود کتابوں کے سرورق سے نئی شائع ہونے والی کتابوں کے متعلق آگاہی ہو جاتی ہے۔ مجھے حسن عسکری کاظمی کے غزلوں کے مجموعے ''خیمۂ شب'' کا ٹائٹل بہت پسند آیا۔
افسانوں میں جو پڑھے ہیں۔ ان میں حبیب الرحمٰن کا ''ادھوری کہانیوں کا نوحہ'' بہت پسند آیا۔ کہانیوں کے ذریعے گفتگو منفرد لگی۔ ادھوری کہانیاں مکمل پیغام دیتی دکھائی دیں۔ سید تحسین گیلانی کا خواب کے تانے بانے کو الجھاتا ''کہانی ایک خواب کی'' بہترین افسانہ تھا۔ ان کا یہ افسانہ پڑھتے ہوئے انھی کا ایک شعر یاد آ گیا

در و آتا ہے آنکھ میں میری　　　میں جو سوؤں تو خواب بین کریں

گیلانی بھائی سے چند ہفتے پہلے ملاقات ہوئی۔ مطالعہ کے حوالے سے بات ہوئی تو میں نے کہا کہ آج کل لوگ پڑھنے کے بجائے لکھنے پر توجہ دے رہے ہیں تو انھوں نے کہا۔ ''میرے خیال میں لوگوں کو ایک کلو پڑھنے کے بعد ایک پاؤ لکھنا چاہیے، مگر مسئلہ یہ ہے کہ ہم ایک پاؤ پڑھتے ہیں اور ایک کلو لکھتے ہیں۔''
نیلما ناہید درانی نے ''بس اسٹینڈ کی کہانی'' میں بہت خوبصورت منظر کشی کی۔ محمد آفتاب تابش کا ''جھولا'' بھی اچھا تھا۔ سیدہ آمنہ ریاض کی ''داڑھ نکلوانے کی کہانی'' بھی دلچسپی سے پڑھی کیونکہ گزشتہ دنوں داڑھ کے درد کی تکلیف سے گزرا ہوں۔ مضامین میں جمیل یوسف اور محمد ارشاد کی تحریریں اچھی تھیں۔ جلیل عالی کی ''یاد یار دیرینہ'' رشید امجد کی یادوں پر مبنی ایک خوبصورت تحریر تھی۔
گزشتہ دنوں معروف شاعر و دانشور اے غفار پاشا کی عیادت کے لیے گئے۔ وہ پچھلے ایک سال سے بیمار ہیں۔ چند ماہ پہلے ہمارے شہر کے ہی معروف شاعر محمود غزنی اچانک بیمار ہوئے اور پھر دنیا سے چلے گئے۔ گزشتہ کچھ عرصے میں اچانک بہت سے ادیب و شاعر یہ دنیا چھوڑ گئے۔ جن کا معلوم ہوا کہ وہ کافی بیمار ہیں اور وہاں جا سکتے تھے۔ وقت نے یہ موقع بھی ہاتھ نہ آنے دیا۔ چنانچہ پاشا صاحب کی بیماری کا علم ہوا تو فوراً دوستوں کے ساتھ ان کی عیادت کے لیے گئے۔ اللہ تعالیٰ انھیں صحت کے ساتھ طویل زندگی دے کہ وہ ہمارے شہر کا اثاثہ ہیں۔ پاشا صاحب کا ہی ایک قطعہ یاد آ رہا ہے:

اگر دنیا میں اچھے لوگ تم کو بھی ملیں ہمدم　　　وہیں اچھا انھیں کہنا، وہیں تعظیم کر لینا
عجب دنیا دو رنگی ہے کسی کی ذات پر پاشا　　　عقب میں طنز کرنا سامنے تسلیم کر لینا

رخشندہ نوید اور اعجاز رضوی کی نظمیں بھی پسند آئیں۔ خطوط میں آصف ثاقب کا جذبات اور پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ یقیناً ان جیسے بزرگوں سے آج کی نسل بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔

کاغذی دھوپ

کتابِ دل

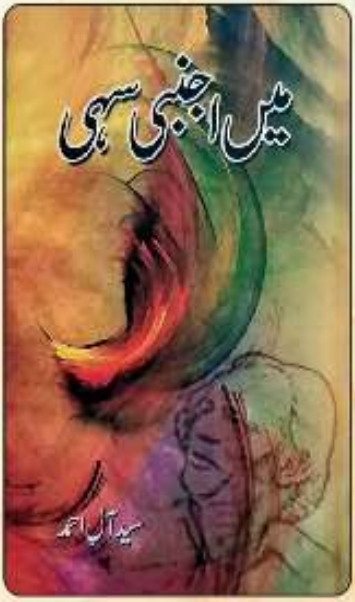

منزلِ کربلا

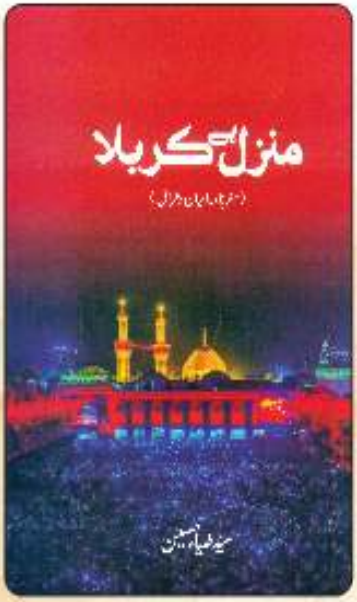

میں اجنبی سہی
سید آلِ احمد

AKG CANADA

VISA IMMIGRATION SERVICES

We are a Canadian based licensed immigration practicing firm, providing customized solutions and advise on matters related to Canadian Immigration

HERE'S WHAT WE OFFER:-

- Express Entry
- Permanent Residence
- Provincial Nominee Program
- Family class sponsorship
- Visitor Visa
- Student Visa
- Business Investor Immigration
- Immigration Refugee

www.akgcanada.com info@akgcanada.com +1-647-617-0888